دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ
معارف

جلد نمبر ۱۹۰ ماہ شوال المکرم ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۱۲ء عدد ۲

فہرست مضامین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

آسام میں خاک وخون کا یہ کھیل اس سے پہلے بھی کئی بار کھیلا جا چکا ہے۔۱۹۸۳ میں نلّی میں تین ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔اس کے بعد بھی مسلم آبادیوں پر شر پسندوں کے حملے جاری رہے۔بانس باڑی پر اسی قسم کے ایک حملے میں سو سے زیادہ مسلمان قتل کر دیے گئے تھے۔بوڈ ویٹری ٹوریل کونسل (BTC) اور بوڈوٹیری ٹوریل اٹانمس ڈسٹرکٹس (BTAD) کی تشکیل کے بعد جیسا کہ اندیشہ تھا اس مہم میں مزید تیزی آ گئی ہے۔BTAD جن اضلاع پر مشتمل ہے ان میں سے کئی اضلاع میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔اس کے باوجود انتظامی اور سیاسی اختیارات بوڈو قبائلیوں کے ہاتھ میں ہیں۔اب منصوبہ بند طور پر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کر کے ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ کر لیا جائے۔اس مقصد کے حصول کے لیے شر پسندوں نے اس علاقہ میں گذشتہ ایک دہے میں مسلم آبادی میں غیر معمولی اضافہ کا ہوّا کھڑا کیا۔کہا جارہا ہے کہ اس دوران مسلمان بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش سے نقل مکانی کر کے اس علاقہ میں آباد ہو گئے ہیں۔اس جھوٹے پروپگنڈہ میں بوڈو شر پسندوں کو میڈیا اور آسام اور ملک کی فسطائی طاقتوں کا مکمل تعاون حاصل ہے۔اس طرح اس علاقہ کی مسلم آبادی کے ایک بڑے حصے کو ملک بدر کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔حکومت کی نااہلی اور بے حسی کی وجہ سے اصلاح احوال کے امکانات معدوم ہوتے جارہے ہیں اور یہ علاقہ بارود کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔کوکرا جھار اور آس پاس کے اضلاع میں جاری تشدد کی موجودہ لہر اسی منصوبہ کا حصہ ہے۔اب تک ۷۷ قیمتی انسانی جانیں اس کی نذر ہو چکی ہیں اور سینکڑوں بستیاں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہیں۔چار لاکھ افراد ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

آسام سے مسلمانوں کا پہلا رابطہ ۱۲۰۶ء میں اس وقت ہوا جب ملک عزالدین محمد بختیار خلجی نے اس راستہ سے تبت پر فوج کشی کی۔بختیار خلجی غیر معمولی صلاحیت کا فوجی قائد تھا۔تیرہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہار اور بنگال کی فتح کا سہرا اسی کے سر ہے۔یہ مہم ناکام رہی البتہ اس کے نتیجہ میں اس خطہ میں بنگال کے مسلم حکمرانوں کی دلچسپی بڑھ گئی اور وہ وقتاً فوقتاً اس علاقہ کو اپنے زیر نگین لانے کی کوششیں کرتے رہے۔اس خطہ کی مخصوص جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے یہ کوششیں کبھی کامیاب ہوتیں اور کبھی ناکام۔ آسام کے حکمران بنگال کے مسلم حکمرانوں کے باج گزار بھی رہے اور کبھی کبھی ان جنگوں میں مسلمان آسامیوں

کے ہاتھوں قید بھی ہو جاتے۔ آسام میں مسلم آبادی کے بنیاد گذار یہی مسلمان قیدی ہیں۔ ان قیدیوں کے ساتھ آسام کے حکمرانوں نے اچھا سلوک کیا۔ انہوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کیں اور اور اس طرح ان کی آنے والی نسلیں عام آسامیوں کے انداز میں پروان چڑھتی رہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ یہ لوگ مقامی رنگ میں رچتے بستے چلے گئے۔ اسی زمانہ میں اس علاقہ میں مبلغین اور صوفیہ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتداءً اس کا سبب بھی یہی چھوٹی موٹی مسلم آبادیاں تھیں۔ مقامی حکمراں صوفیہ کے ساتھ عزت اور احترام کا معاملہ کرتے تھے اور ان کی خانقاہوں اور مزارات کو عطیات دیتے تھے۔ ان کی آمد سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہاں کی مسلم آبادیاں ان کی تعلیمات اور رہنمائی میں اپنا مذہبی تشخص باقی رکھنے میں کامیاب رہیں ورنہ اندیشہ تھا کہ وہ مقامی تہذیب میں اس طرح ضم ہو جاتیں کہ ان کا اپنا کوئی تشخص باقی نہ رہتا۔ مزید براں ان کے زیر اثر کچھ مقامی باشندے بھی اسلام قبول کرتے رہے اور اس طرح آسام کی مسلم آبادی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چونکہ صوفیہ کو حکمرانوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام پوری طرح پر امن تھا اس لیے اس کی وجہ سے آسامی معاشرہ میں کوئی کشمکش نہیں پائی جاتی تھی اور مسلمان مقامی باشندوں کے ساتھ امن و آشتی سے زندگی گذارتے تھے۔

اس خطہ پر تسلط حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہاں کی زمین چائے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھی۔ ساتھ ہی گنے کی کاشت کے امکانات بھی روشن تھے۔ لیکن ان امکانات کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں مزدوروں کی کمیابی تھی۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے انگریز آبادکاروں نے علاقہ کے باہر سے مزدوروں کی درآمد کا منصوبہ بنایا۔ فطری طور پر ان مزدوروں کی بڑی تعداد پڑوسی علاقے مشرقی بنگال سے آئی جو اب بنگلہ دیش ہے۔ ان کی غالب اکثریت مسلمان تھی۔ پڑوسی علاقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ یہاں کی زراعت کی ضروریات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے اور وہ آسامی مزدوروں کے مقابلہ میں سستے بھی تھے۔ مزید اراضی کو زیر کاشت لانے کے مقصد سے جنگلوں کی صفائی کے لیے مزدوروں کی مانگ بڑھتی گئی۔ چنانچہ پورے برطانوی دور میں مشرقی بنگال سے مسلمان آسام آتے رہے اور بڑی تعداد میں وہاں سے نقل مکانی کر کے آسام میں آباد ہوتے رہے۔ آنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو مشرقی بنگال کی گنجاں آبادی کے مقابلہ میں آسام میں زیادہ روشن مستقبل کی امید کر سکتے تھے اور یہاں نسبتاً زیادہ آسانی سے زمین کے حصول کے امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

مشرقی بنگال سے اس طرح نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ۱۹۳۱ کی مردم شماری میں خاص طور سے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مردم شماری کے سپرانٹنڈنٹ کے مطابق گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں یہ آسام میں ظہور پذیر ہونے والا سب سے اہم واقعہ تھا جس کے آسامی معاشرہ پر دوررس اثرات مرتب ہوں گے اور وہاں آبادی کا تناسب ہمیشہ کے لیے بدل جائے گا۔ اس کے باوجود اس دور میں بھی مقامی آبادی کے ساتھ کسی کشمکش اور تصادم کا سراغ نہیں ملتا۔

اس تفصیل سے یہ بات ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ آسام میں آباد بنگالی مسلمانوں کی غالب اکثریت ان تارکین وطن کی اولاد ہیں جو برطانوی عہد میں مشرقی بنگال سے نقل مکانی کرکے یہاں آباد ہوگئے تھے۔ ان کی نسلیں یہیں پروان چڑھیں۔ ماضی قریب میں اگر اس طرح کی نقل مکانی ہوئی بھی ہو تو وہ یکسر ناقابل لحاظ ہے۔ یہ الزام کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں غیر قانونی طور پر نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے یکسر بے بنیاد ہے اور اس کے حق میں کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں نہ صرف یہ کہ اس علاقہ کی مسلم آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ پچھلے چند برسوں میں اس میں واضح کمی آئی ہے۔ اگرچہ مذہبی بنیاد پر ۲۰۱۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار ہنوز دستیاب نہیں ہیں لیکن غیر حتمی نتائج کے مطابق ۲۰۰۱ اور ۲۰۱۱ کے درمیان کوکراجھار میں مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح صرف ۵.۱۹ فیصد رہی۔ جبکہ اسی عرصہ میں آسام میں بحیثیت مجموعی آبادی میں اضافہ کی شرح ۱۶.۱۹ فیصد رہی۔ اس طرح گذشتہ دس سال کے عرصہ میں کوکراجھار کے علاقہ میں مسلم آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے بجائے ۹ فی صد کی غیر معمولی کمی درج ہوئی ہے۔ مسلم شرح آبادی میں اس گراوٹ کی صرف ایک ہی معقول توجیہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ۲۰۰۳ء میں BTAD کی تشکیل کے بعد اس کے زیر اثر وہاں ظہور پذیر ہونے والی مخصوص صورت حال کی وجہ سے کوکراجھار سے دوسرے نسبتاً زیادہ محفوظ علاقوں کی طرف آبادی کی منتقلی کا عمل شروع ہوچکا ہے۔ ظاہر ہے وہاں سے نقل مکانی کرنے والے بوڈو نہیں ہوسکتے جن کو وہاں اقتدار حاصل ہے اور جو علاقہ کو غیر بوڈو عناصر سے پاک کرنے کی مہم چلارہے ہیں۔ حتمی طور پر یہ مسلمان ہی ہوسکتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اب وہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر دوسری نسبتاً محفوظ جگہوں کی طرف منتقل ہورہے ہیں۔ ان حقائق کے بعد یہ کہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ گذشتہ ایک دہے میں مسلمان بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش سے آکر یہاں بس گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک منصوبہ بند جھوٹے پروپگنڈہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

مقالات

تصوف اور خوف کی نفسیات

حیات عامر حسینی

(۲)

ایک شخص کے علم اور معرفت میں جتنی گہرائی، شدت اور کمال آتا جائے گا، اتنا ہی اللہ سے اس کا تعلق گہرا ہوتا جائے گا۔

قربت جتنی بڑھتی جائے گی، اللہ کے خوف میں اتنی ہی شدت پیدا ہوگی۔ اللہ کا خوف انسان کے علم کے مطابق ہے۔ معرفت الٰہی انسان کی محبت کو مضبوط کرتی جاتی ہے اور محبت جتنی گہری ہوگی، خوف بھی اتنا ہی شدید ہوگا۔ غزالی کے خیال میں کمال کے لیے، علم خداوندی اولین شرط ہے، کیونکہ اس کے بغیر خدا کی محبت ممکن نہیں لیکن خدا کا علم ہر حال میں خدا کی محبت نہیں ہوتا۔ محبت علم سے زیادہ اعلی وارفع معیار مطلوب ہے۔ شہاب الدین سہروردی نے کہا ہے کہ محبت خاص اور منفرد ہے۔ یہ انسیت سے بہت ارفع ہے۔ کیونکہ جملہ محبت انسیت ہے لیکن ہر انسیت محبت نہیں ہوتی لیکن انسیت علم سے اعلیٰ ہے کیونکہ کل انسیت علم ہے لیکن سارا علم انسیت نہیں۔ علم کا تعلق جسم یا روح سے موافقت سے ہے۔ جب اس کا تعلق روح سے ہو تو یہ خیر اعلیٰ کہلاتا ہے اور خیر اعلیٰ کی بنیاد علم اور انسیت ہے۔

خوف خدا کا تعلق جہالت سے نہیں کیونکہ جہل یا لاعلمی خوف خدا پیدا نہیں کرتی۔ خوف علم سے پیدا ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ علم خوف کی بنیاد ہے۔ علم جتنا وسیع اور گہرا ہوگا خوف کی شدت بھی اتنی ہی ہوگی۔ محبت کا انتہائی مطلوب ذات خداوندی ہے کیونکہ وہ ان تمام علل کا منبع

شعبہ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہے جو محبت کی بنیاد ہیں ۔محبت خدا ہی سے تمام اخلاقی وسماجی اقدار پیدا ہوتی ہیں ۔انتہائی خوف کا تعلق عرفان ذات الٰہی سے ہے ۔اس لیے یہ اس کی محبت سے جڑا ہوا ہے ۔

غزالی نے مسئلہ خوف پر بہت طویل بحث کی ہے ۔اس کے معانی اور حقیقت کا بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ خوف درد دل اور سوز دروں کا نام ہے جو زمان آیندہ کی کسی بری توقع کے سبب ہوتا ہے ۔واسطی کے حوالے سے وہ اسے خدا اور بندے کے درمیان حجاب کہتے ہیں ۔خوف کی حالت اور شدت کا احساس کسی شے کی خاصیت کے علم کے مطابق ہوتا ہے اور جس قدر یہ خاصیتیں اور ان کا علم کم ہو،خوف بھی اتنا ہی کم ہوگا ۔ برے اسباب کے علم سے دل میں جو سوزش اور درد پیدا ہوتا ہے، وہ خوف ہے ۔خدا کا خوف اس کی معرفت اور اس کی صفات کے علم سے پیدا ہوتا ہے ۔احساس گناہ سے بھی خوف پیدا ہوتا ہے ۔

کائنات کی ہر شے اپنے خواص اور قوت میں یکساں نہیں ہر شے اپنے آپ میں اپنے خواص اور قوت میں محدود ہے ۔ اس لیے ان کا خوف بھی مطلق نہیں ۔مطلق خوف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذات جس کی وجہ سے یہ خوف پیدا ہوجائے مطلق قوت کی حامل اور کامل ہو لیکن ایسی کوئی شے ہے ہی نہیں ۔صرف اللہ کی ذات ہے جو اپنے آپ میں مطلق اور کامل ہے ۔لہٰذا اس کا خوف بھی انتہائی شدید ہوگا اور یہ خوف صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک شخص کو اپنے نفس اور خدائے تعالیٰ کی کامل صفات کا علم ہو۔عرفان نفس اور خدا کی ذات وصفات کا علم،انسان کو گناہوں سے روکتا ہے اور یہی خوف اسے نیک اعمال کی طرف لے جاتا ہے ۔انسان کے نیک اعمال،مراقبہ،محاسبہ اور مجاہدہ اسی قدر قوی ہوں گے جتنا قوی اور شدید خوف ہوگا ۔ ۔اسی علم اور خوف کی وجہ سے انسان نہ صرف گناہوں سے رکتا ہے، بلکہ ان تمام اعمال سے بھی رک جاتا ہے جس میں حرمت کا امکان پیدا ہوجائے ۔اسی کو تقویٰ کہتے ہیں ۔ورع حرام چیزوں سے باز رہنے کو کہتے ہیں ۔شبہات کے خوف سے حلال چیزوں کو چھوڑ دینے کا نام صدق فی التقوی ہے اور دنیا سے التفات نہ کرنے اور اس سے علاحدہ ہونے کو صدق کہا جاتا ہے ۔ یہ روحانی مراتب ہیں جو خوف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔

غزالی نے خوف کی جو تطبیق اور درجہ بندی کی ہے اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے ۔

(الف) ایسی شے کا علم جو بذاتہ خوف زدہ کرنے والی ہو جیسے درندوں کی صفات و قوت کا علم۔

(ب) اپنے اعمال اور گناہوں کا شعور یا معرفت اور نتیجتاً خدا کی ناراضگی کا خوف۔

(ت) خدا سے مہجوری کا خوف۔

غزالی کے خیال میں تیسرا درجہ یعنی خدا سے مہجوری کا خوف صرف صدیقین کو ہوتا ہے۔ انسان کے دل میں خدا کے خوف کی شدت و گہرائی اس کے علم و آگہی کے مرتبہ کے مطابق ہوتی ہے۔خوف اس وقت مذموم اور ناپسندیدہ کیفیت اور عمل بن جاتا ہے جب اس کی شدت انسان کو اعمال صالحہ سے روک دے۔خوف کی اعلیٰ اور پسندیدہ قسم وہ ہے جس سے کمال معرفت پیدا ہوجائے۔غزالی کے خیال میں وہ خوف سب سے اعلی ہے جس کا مصداق خدائے کریم ہے۔گناہ سے ڈرنا صلحا کا خوف ہے لیکن خدا سے ڈرنا موحدین اور صدیقین کا خوف ہے اور یہ خوف معرفت ذات الٰہی اور معرفت صفات الٰہی سے پیدا ہوتا ہے۔خوف کے مختلف احوال اور اس کی مختلف کیفیات اور درجے ہیں لیکن سب سے اعلی درجہ عارفین کا ہے جن کو خوف فراق یعنی خدا تعالی سے محجوب رہنے کا خوف ہو۔

انسان کا منتہائے مطلوب سعادت یعنی رضا و دیدار خداوندی ہے۔ ہر شے کی فضیلت اس کے منتہائے مطلوب سے قربت سے ہے۔ جو چیز اس کے حصول میں جتنی مددگار ہو وہ اتنی ہی افضل ہے۔خوف چونکہ شہوات کو جلاتا، گناہوں سے بچاتا اور طاعات کی ترغیب دیتا ہے، اس لیے یہ افضل بھی ہے اور مطلوب بھی۔اسی کی وجہ سے عفت، ورع، تقوی اور مجاہدہ حاصل ہوتے ہیں جو منتہائے مطلوب کے حصول میں مدد کرتے ہیں۔

اہل جنت کے چار مقام ہیں، ہدایت، رحمت، علم اور رضا۔ یہ چاروں مقام خائفین کے ہیں جس کا خوف الٰہی جتنا شدید ہوگا اتنا ہی وہ اپنے رب کے قریب ہوگا۔اسی لیے ان کو علماء یعنی علم والے بھی کہا جاتا ہے۔کسی بھی مومن کا دل خوف سے خالی نہیں ہوتا۔خوف کی شدت، ایمان ومعرفت کی شدت کو ظاہر کرتی ہے اور خوف کی کمی ایمان اور معرفت کی کمی کو ثابت کرتی ہے۔امن اور بے خوفی صرف ان کو حاصل ہوتی ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس کا

دل نرم، محبت پختہ اور عقل درست ہو جاتی ہے۔

خوف خدا کے ساتھ رجا کا ہونا لازمی ہے، کیونکہ رجا وہ حالت نفسی ہے جو انسان کو رحمت خداوندی کے قریب کر دیتی ہے۔ رجا کا منبع خدا کی رحمت ہے جو محبت خداوندی کو پیدا کرتی اور جلا بخشتی ہے۔ نہ تو مطلق رجا اچھی شے ہے اور نہ مطلق خوف۔ دونوں کے درمیان تطبیق لازمی ہے۔ خوف نیک اعمال کی ترغیب دیتا ہے اور رجا ان کے نتیجے میں خدائے قدوس کی رضا و دیدار کی امید ہے۔ قرآن کی آیات کریمہ کے مطابق خدا کی رحمت سے ناامیدی کافروں کا شیوہ ہے، امید دل کو تقویت دیتی ہے اور اللہ کی محبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔ یوں خوف، رجا اور محبت ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ معرفت الٰہی کی بنیاد محبت الٰہی اور دنیا سے دوری ہے۔ ان تینوں سے مختلف روحانی مراتب کا حصول ہوتا ہے۔ مقام صبر خوف و رجا سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے مقام مجاہدہ، ذکر الٰہی اور فکر دائمی کا حصول ہوتا ہے۔ دوام ذکر سے انس اور دوام فکر سے کمال معرفت ملتی ہے اور کمال معرفت وانس سے محبت کا مقام ملتا ہے اور یہی سالک کو مقام رضا و توکل پر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی مقام نہیں کیونکہ محبت کے لیے ضروری ہے کہ محبوب کے فعل پر راضی رہے اور اس کی عنایت پر اعتماد رکھے۔ جبھی تو اس کا ہر عمل خدا کی مرضی کے مطابق اور اسی کا عمل بن جاتا ہے۔ خوف و رجا قلب انسانی سے تمام کثافتوں کو دور کرتے ہیں اور اسے معرفت ذات کے لیے تیار کرتے ہیں۔

رجا کا مرتبہ خوف سے بلند ہے، کیونکہ اس کا منبع خدا کی رحمت ہے۔ جب کہ خوف کا منبع خدا کی صفت غضب ہے۔ لہٰذا مرتبہ اس کا بلند ہے جو خدا کی محبت میں نہ کہ اس کے خوف سے اعمال صالحہ انجام دیتا ہے۔ رجا یا امید انسان کی محبت کو گہری اور مضبوط کرتی ہے اور اسے اس قابل بناتی ہے کہ اسے معرفت خداوندی حاصل ہو۔ اس لیے محبت سب سے بلند ہے لیکن محبت محبوب کے خوف کو اپنے اندر پالتی ہے۔ کیونکہ عاشق کے لیے سب سے بڑا عذاب اس کے محبوب سے دوری کا خوف ہے۔ یوں خوف وہ مہمیز ہے جو اس کی محبت کو جلا بخشتی ہے اور اسے اس کے اور قریب کرتی ہے۔

تخلیق کائنات کو اللہ نے ایک بامقصد عمل بتایا ہے۔ کوئی کھیل نہیں اس کائنات میں

اللہ نے انسان کو سب سے معزز تخلیق بنایا۔ اللہ نے ان دونوں کے مقصد تخلیق کا بیان قرآن پاک میں کئی جگہ پر فرمایا۔ ان تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- یہ ساری تخلیق ایک مقصد کے تحت بنائی گئی، یہ کوئی کھیل نہیں۔

۲- انسان کو اللہ نے سب سے اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ اسے عزت وشرف سے نوازا۔ اسے اپنا خلیفہ بنایا اور اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔

۳- ساری کائنات اس کا میدان عمل ہے۔ اس کی تسخیر اور اس کی حقیقت اور اسرار اور رموز کو سمجھنے کے لیے اسے علم عطا کیا۔

۴- اسے حواس خمسہ، عقل، وجدان اور وحی کی قوتیں عطا کیں۔

۵- ان ہی قوتوں کے جائز اور تخلیقی عمل اور استعمال کے ذریعہ وہ اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔

۶- اللہ کے قرب کے معنی اس کی عبادت کے ذریعہ اس کی رضا کا حصول ہے۔

۷- اور عبادت کے معنی محض فرائض کی ادائیگی نہیں بلکہ اللہ، کائنات اور انسان کے حقوق کی فہم اور ان کی ادائیگی ہے۔

۸- اور اس کے معنی ایک ایسے تہذیبی وانسانی نظام کی پرداخت اور اس کا نفاذ ہے، جسے اللہ نے اپنے پیغامبروں کے ذریعہ بھیجا۔

۹- یہ تعلیمات اقدار اعلیٰ کا وہ مجموعہ ہے جو انسان کو تمام مخلوق میں احسن بناتی ہیں اور اسے اللہ کے صفات کی فہم عطا کرتی ہیں۔

۱۰- ان تمام اعلی اقدار کا سب سے اعلی نمونہ اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ ہیں۔ جنہیں رہتی دنیا تک انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا۔

۱۱- انسان کو آزادی کی قوت دی گئی تاکہ وہ اپنے اعمال انجام دے سکے۔

۱۲- اسی آزادی اور اعمال کی بنیاد پر اسے قیامت کے دن اللہ کے سامنے حساب دینا ہوگا۔

۱۳- اس کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار، رسولؐ کی غیر مشروط اطاعت اور محبت پر ہے۔

۱۴- اللہ کی رضا اسے دائمی کامیابی یعنی سعادت یا دیدار وقرب خداوندی اور ناکامی

یعنی شقاوت یا خدا سے دوری یعنی عذاب خداوندی سے ہم کنار کردے گی۔

جنت وہ مقام ہے جہاں پہ اسے دیدار خداوندی ہوگا اور جہنم وہ جگہ ہے جہاں وہ ہمیشہ خدا کی ناراضگی اور اس سے مہجوری اور دوری کی آگ میں جلتا رہے گا اور اسے کبھی دیدار خداوندی نصیب نہیں ہوگا۔صوفیائے کرام کی تمام تعلیمات کا نچوڑ اور مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔

۱۵-تصوف کی ایک مکتب عملی وفکری کی حیثیت سے نشو ونما پر بحث یہاں ہمارے دائرہ کار سے خارج ہے۔ہم صرف اس نقطہ پر بحث کریں گے کہ ابتدائی صوفیہ علی الخصوص حضرت حسن بصری نے خوف کے تصور کو بنیادی فکری و عملی اصول کے طور پر آگے کیوں بڑھایا اور اسے حجۃ الاسلام امام غزالی نے کیوں اسلام کے فلسفہ اخلاق وتصوف کا ایک کلیدی اصول مان کر اس کی فلسفیانہ وفکری جہتوں کی تدوین وترویج وتشریح کی اور اسے ایک کلی قضیہ کے طور پر پیش کیا۔

لیکن اس بحث سے پہلے اس نقطے کو سامنے لانا ضروری ہے کہ دور خلافت راشدہ کے خاتمہ کے ساتھ ہی جو زبردست، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی اور نظریاتی بحران پیدا ہوا، اس کا اسلام کے بنیادی اصولی ڈھانچے سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ یہ نتیجہ تھا ان تشریحی وتوضیحی موشگافیوں کا جن کے بیج جبریہ اور سیاسی طالع آزماؤں نے بوئے۔ سطحی سیاسی اختلافات کو بنیادی اختلافات میں تبدیل کرکے اختلافات اور خوں ریزی کی ایک ایسی داستان لکھ دی گئی کہ جس کے اثرات سے آج بھی امت چھٹکارا نہیں پارہی ہے۔

اسلام کی جمہوری روح کو کچل کر ایک جابرانہ سیاسی نظام یا ملوکیت کی پرداخت کی گئی اور اپنی مخصوص مذہبی فکر کو شدت پسندی اور حتمی دین کی خودساختہ شکل دی گئی، یہ شدت پسندی اور جمہوریت کش طریقہ کار ہر ایک گروہ نے اختیار کیا اور اپنے طریق کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تشریحات وتوضیحات کا ایک جال پھیلا دیا۔ان سارے اختلافات، جنگ وجدل اور مذہبی متکلمانہ مناظرہ بازی کا اسلام اور اس کے آفاقی نظریہ حیات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ سب کچھ ایک تشریحی مغالطہ سازی تھی، جس کے یا تو یہ گروہ شکار ہوگئے یا انہیں اس کا شکار بنایا گیا۔

اس کا واضح ثبوت جمل، صفین اور نہرواں کی خوں ریز جنگیں ہیں۔ جہاں مرکز خلافت اور خلیفہ کے اختیارات کو نظر انداز کرکے دین کی سطحی اور شدت پسندانہ تشریح کے ذریعہ جمہور

مسلمین کے عقائد اور اتحاد کو توڑنے کی کوشش کی گئی۔

دوسری طرف یہود کی مکروہ سازشیں اور چالبازیاں اپنا کام کر رہی تھیں۔ کلام پاک کی آیات کی ان کے سیاق وسباق اور حضورؐ کی سنت عالیہ سے انحراف کرتے ہوئے تشریحات کا انبار لگا دیا گیا اور فلسفہ جبر کو بڑی ہی عشوہ طرازیوں کے ساتھ پیش کیا گیا اور یہی وہ فلسفہ ہے جو اسلام کی تمام تعلیمات کا غارت گر ہے، بنوامیہ نے اسے شہادت حسینؓ سے اپنے آپ کو الگ رکھنے اور تمام دوسرے قابل گرفت اعمال کو چھپانے کے لیے جواز کے طور پر پیش کیا اور پھیلا بھی دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کلی طور پر جبر کو رد کیا ہے۔ کیونکہ یہ توحید کے خلاف ہے۔ یہ ایک منطقی مغالطہ اور جھوٹ ہے ٹھیک اسی طرح کلی آزادی یا قدر کا فلسفہ بھی ایک دھوکہ ہے کیونکہ اگر انسان مجبور محض ہے اور اس کا ہر عمل خدا کا تراشیدہ ہے تو پھر نہ صرف قیامت، میزان، نکیر ومنکر اور جواب دہی بلکہ رسالت کے جواز پر ہی سوالات پیدا ہوجاتے ہیں اور اگر انسان کو مختار کل مانا جائے جیسا کہ قدریہ کا عقیدہ ہے تو پھر خدا کے اختیار وقدرت کاملہ پر سوالات پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظریات ازخود غلط اور سطحی ہیں، کیونکہ خدا کی قدرت کاملہ کے اصول کے اقرار سے انسان کی مجبوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ خدا نے اسے اپنا خلیفہ بنا کر اختیارات سے نوازا اور ان اختیارات کے نفاذ واطلاق کے لیے اسے علم کے تمام ذرائع عطا کیے اور اس کی ہدایت وجواب دہی اسی آزادی، علم اور اختیارات کے ساتھ مربوط ومشروط ہے۔

ان حالات میں جب کہ ہر طرف دولت کی بہتات اور ناگفتہ بہ اعمال کا بازار گرم اور سیاسی جوڑ توڑ اور سازشیں عروج پر ہوں، انسانی خون پانی کی طرح بہایا جارہا ہو، عزتیں تاراج کی جارہی ہوں اور اپنے تمام غلط اعمال کی جواب دہی سے بری الذمہ ہونے کے لیے جبر کا فلسفہ دلوں میں اتارا جارہا ہو اور ساتھ ہی ساتھ حکمرانوں کے مظالم اپنی انتہا پر پہنچ چکے ہوں، تو ان حالات میں انسانوں کو غلط اور شیطانی راستے پر جانے یا ان سے ہٹانے کے لیے اللہ کے خوف کے سوا کس تصور اور طاقت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ظالم وجابر بادشاہ اور اس کی قاہر و انسانیت ودین دشمن فوج کو کون روک سکتا ہے؟ بچاؤ کی دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں۔ یا تو ایک نئی قوت

جمع کر کے ایک جوابی انقلاب کے ذریعہ ان قوتوں کو ختم کر دیا جائے (۲) یا پھر خاموشی و گوشہ نشینی اختیار کر کے محض اپنے آپ کو بچایا جائے ۔ جوابی فوجی انقلاب ۔ ہمیشہ ایک خونیں داستان رقم کر دیتا ہے ۔ جس میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کا قتل ہوتا ہے اور ان کی عزتیں تاراج اور ان کی جائدادیں برباد کر دی جاتی ہیں ۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ فوجی انقلاب کے ذریعہ یا مزاحم عسکری قوتوں کے درمیان تصادم میں انسانیت مظلوم نہ بن جائے ۔

صوفیائے کاملین نے ان ہر دو صورتوں پر غور کیا اور امت مرحومہ کو ان حالات اور ظالم و جابر بادشاہوں ، فوجی قوتوں اور معاشی و سماجی استحصال کرنے والی قوتوں اور دین و مذہب کے جھوٹے ٹھیکیداروں اور علمائے سو سے نجات دلانے کے لیے انہوں نے ''خوف خدا'' کا تصور و فلسفہ پیش کیا اور اسے اپنی تعلیمات و تبلیغ کے ذریعہ دلوں میں بہت گہرا اتارنے کی کوششیں کیں کیونکہ خوف خدا کے سوا اب اور کوئی مزاحم قوت تھی ہی نہیں جو انسانیت کو ظالموں اور جابروں سے بچا سکتی ۔ اس فلسفہ و تصور کو پیش کرنے والے پہلے صوفی حضرت حسن بصریؒ تھے جن کی مذہب ، فقہ ، تفسیر ، سیاست ، حدیث اور امت کے تمام حالات پر گہری نظر تھی ۔ ان کی بے باک آواز جبر کے فلسفہ کے رد میں اٹھی اور ان کے دردمند دل نے انسانیت کو بچانے اور اسے خدا کے نزدیک لانے اور اس سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے لیے ''خوف'' کا تصور پیش کیا ۔

یوں اسلامی تصوف اور روحانیت جبر کے خلاف ایک منظّم آواز تھی اور اس کا مقصد انسانوں کو تمام استحصالی قوتوں سے آزاد کر کے خدا سے اس کا تعلق قائم کرنا تھا ۔ جبر جملہ ، اخلاقی روحانی و سماجی و سیاسی فساد ، تشدد اور مطلق العنان حکمرانی اور استحصال کا دوسرا نام ہے ۔ یہ ایک غیر اخلاقی ، غیر جمہوری ، غیر اسلامی اور ظالمانہ رویہ ہے جو زندگی کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان سے اس کی عظمت و وقار و شرف اور آزادی کو چھین کر اسے بہت ہی غلیظ و ادنی سطح پر گرا دیتا ہے ۔ جبر کی ہر شکل فساد و مفاد کی ترجمان ہوتی ہے ۔

ظاہر ہے کہ خوف خدا کے سوا اب کوئی اور چیز بچی ہی نہ تھی جو انسانی قلوب اور نفسیات کو بدل سکتی تھی ۔ خوف کے اس تصور اور فلسفہ کی بنیاد قرآن پاک کی آیات بینات ہی تھیں ۔

قرآن پاک نے بار بار انسانی نفسیات کو تبدیل کرنے کے لیے ''خوف'' کا تصور پیش کیا ،

اس خوف کی انتہا خدا کی ناراضگی اور اس سے دوری و مہجوری ہے۔ انسان کی عارضی زندگی، جس کے بعد اسے سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، اگر وہ برائیوں سے نہ بچا اور ان سے توبہ نہ کی۔

دائمی رسوائی و عذاب کا خوف بجائے خود ایک ایسی مزاحم قوت ہے جو بڑے بڑے جابروں کے دلوں کو بدل دیتی ہے، سوائے ان کے جن کے قلوب پر اللہ نے سیاہی و بدنصیبی کی مہر کردی۔ حضرت حسن بصریؒ نے ''خوف'' کی تبلیغ کر کے انسانی دلوں کو جھنجھوڑ دیا، انہیں اس عارضی دنیا اور یہاں کی عیاشیوں اور مظالم کی حقیقت سمجھا دی اور انہیں یہ بتا دیا کہ اگر وہ اس سے نہ ہٹے تو دائمی تباہی و ذلت ان کا انتظار کر رہی ہے۔

خوف انسانی سماج کے تانے بانے کو قائم رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ حکومت کا خوف، قانون کا خوف، سزا کا خوف، ماں باپ کا خوف وغیرہ، اگر خوف کی یہ مزاحم قوت یا تصور نہ ہو تو شاید انسانی سماج اور وجود بکھر کے رہ جائے۔ یہ تمام خوف تو عارضی اور کم پایہ ہیں اور یہ کسی شخص کو دائمی زندگی کی رسوائی سے نہیں ڈرا سکتے اور نہ کسی ایسے ظالم و جابر کا ہاتھ روک سکتے ہیں، جو خود ایک جھوٹا اور خود ساختہ قانون ہوتا ہے اور جس کی ہر بات حتمی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک ایسے ''خوف'' کی ضرورت ہے جو ان تمام قوتوں سے بڑھ کر ہو اور یہ خوف ایک ایسی ذات ہی کا ہوسکتا ہے جو تمام کائنات کی خالق و مالک و حکمران ہے، جسے ذرے ذرے کی دھڑکنوں کا علم ہے اور جس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

یہی خدا کا خوف ہے۔

لیکن خدا کے خوف میں ایک بہت قیمتی موتی پوشیدہ ہے وہ ہے خدا کی ربوبیت و رحیمیت کا احساس، جسے محبت کہہ سکتے ہیں۔

انسان خدا کی محبت میں ہر شے سے خوف کھاتا ہے تاکہ خدا اس سے ناراض نہ ہو جائے اور وہ اس سے دور نہ جا پڑے اور یوں ایک دائمی مہجوری و ذلت کا شکار نہ بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسن بصری اپنے زمانے کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''محبت'' کے تصور کو سامنے نہیں لائے۔ ورنہ وہ تو ہر عظیم صوفی کی طرح اس سے واقف بھی تھے اور سرشار

بھی ۔ یہ کام اس عظیم صوفیہ نے کیا جس کے مرتبہ کی دوسری ولیہ عالم اسلام میں آج تک نہیں نظر آتی ۔ یہ تھیں جناب رابعہ بصری، جنہوں نے خوف اور لالچ سے مبرا ومنزہ ''محبت خداوندی'' کے تصور کو پیش کیا اور فرمایا کہ خدا ہی محبت کے لائق ہے اور میں اس کی عبادت اس کی محبت میں کرتی ہوں نہ کہ جنت کی لالچ یا جہنم کے خوف سے ۔

یہ پاکیزگی قلب اور محبت کی انتہا ہے ۔ لیکن عام انسانیت کی نفسیات بدلنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ دل میں خوف ومحبت کو بسا دیا جائے اور کبھی خوف کے تصور کو آگے بڑھا دیا جائے اور کبھی محبت کے تصور کو ۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جاہل صوفیہ کی طرح وہ محبت کا کوئی ایسا کھیل رچا ئے جو اسے خدا اور اس کی محبت سے ہی دور کردے ۔ انسانی نفسیات اور اعمال کو بدلنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو اس پر خوف مسلط کردیا جائے اور اسے طاقت کے ذریعہ دبا دیا جائے اور غلط اعمال وحرکات سے رکنے کے لیے مجبور کیا جائے ۔ یا اس کے دل میں اچھے کاموں، اصولوں اور شخصیات کی محبت پیدا کی جائے تا کہ وہ برے اعمال سے دور رہے ۔

یہی کام صوفیائے کرام نے کیا ۔ انہوں نے خوف کا تصور پیش کیا، اس کی تبلیغ کی اور قلوب واذہان میں خوف ڈال دیا اور یوں برائیوں سے اجتناب کرنے پر مجبور کیا اور جب انسانوں کی عادتیں بدل گئیں اور ان کی نفسیات میں ایک مضبوط تبدیلی آ گئی تو اس میں محبت کے بیج بو دیے تا کہ وہ محض خوف سے دبے نہ رہیں بلکہ اس ذات عظیم وکریم کی محبت میں اس کا قرب بھی حاصل کریں اور تمام برائیوں سے اجتناب بھی کریں ۔

انسانی نفسیات کا ایک لازمی پہلو یہ ہے کہ جب انسان کسی سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی مرضی کے خلاف جانے کی سوچ بھی نہیں پاتا، چہ جائیکہ اس سے دوری ومہجوری کو برداشت کرلے صوفیہ کے فلسفہ وتعلیمات میں یہ دونوں تصورات پہلو بہ پہلو چلتے رہے ۔ لیکن ان کی مربوط ومضبوط فکری بنیاد، تحلیل اور توضیح وتشریح، امام غزالی نے اپنی عظیم کتاب ''احیاء العلوم'' میں پیش کی ۔ انہوں نے ان دونوں اصولوں کو صرف مزاحم قوتوں کے طور پر پیش نہیں کیا، بلکہ مابعدالطبعیاتی ، مذہبی ، سماجی ، اخلاقی ، روحانی اور علمی اصولوں کی حیثیت سے وسیع فلسفیانہ تناظرات میں پیش کیا ۔ بعد میں تمام آنے والے صوفیہ وحکماء کی تعلیمات میں غزالی کا تتبع واضح

نظر آتا ہے اور اس حقیقت سے کسی صوفی نے انکار بھی نہیں کیا۔ غزالی کی عظمت اور جملہ فلاسفہ پر ان کی فوقیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے جملہ نظریات وتصورات کو پیش کرنے، ان کی صحیح تصویر کشی اور ان کی توضیح وتشریح کے لیے واضح علمی بنیادیں یا علمیاتی طریقہ کار اور ڈھانچہ فراہم کیا۔ ہر تصور کو علمیات کے چوکھٹے میں ڈالا اور اس کی علمیاتی بنیادیں تشکیل دیں اور حدود واضح کیے۔

یوں فلسفہ غزالی کی مابعد الطبعیات، سماجیات اور اخلاقیات اور روحانیت کی بنیادیں علمیات میں پیوستہ ہیں اور اس سے ہٹ کر ان کی تشریح وتوضیح ایک منطقی وفلسفیانہ مغالطہ سازی ہوگی۔

غزالی نے خوف ورجا کو ایک عنوان کے تحت لاکر ان کے تعلق اور کوائف کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ خوف کی حقیقت، حدود اور نتائج پر بھر پور بحث کی ہے۔ یہ ساری بحث فلسفیانہ سے زیادہ نفسیاتی اور علمیاتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا فلسفہ خوف وجودئیین کے فلسفہ خوف سے زیادہ مربوط، منظّم، واضح اور بصیرت افروز ہے اور اس حیثیت سے کہ اس نے خوف کو مستقبل سے جوڑ دیا ہے اور اس کی مابعد الطبعیاتی بنیادوں اور تعلقات کو واضح کیا ہے۔ وہ بہت ہی ارفع فلسفیانہ طرازی سے وجودئین سے سبقت لے گئے ہیں۔ خوف کی اس علمیات کی بنیاد قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور حدیث مبارکہ ہیں جن کا حوالہ بار بار غزالی نے خوف پر بحث میں دیا ہے۔ غزالی نے رجا کے ساتھ خوف کو مربوط کر دیا اور اس کی بنیاد بھی قرآن پاک کی آیات ہیں، جن میں اللہ کی رحمت سے ناامیدی سے منع کیا گیا ہے۔

کسی بھی شے یا کیفیت کا ادراک وحصول علم کے بغیر ناممکن ہے خوف ورجا کے وجود یا ان کے کوائف کا ادراک بھی علم کے بغیر ناممکن ہے۔

خوف کسی شے کی مختلف کیفیات، حالات اور قوتوں اور ان کے مطلوبہ نتائج کے علم سے پیدا ہوتا ہے، جیسے ایک شخص جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے، زہر مارتا ہے، زلزلہ زمین کو ہلا دیتا ہے، پانی ڈبو دیتا ہے وغیرہ وغیرہ، اسی لیے وہ ان سے خوف کھاتا ہے۔ کسی مخبوط الحواس شخص یا بہت ہی چھوٹے بچے کو کسی شے کا خوف ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ اشیاء کے خواص سے واقف نہیں ہوتے، خوف

کی پہلی شرط حواس و عقل کا قائم ہونا اور دوسری شرط اشیاء کے خواص کا علم ہے، ہم جس ان دیکھے اور مختلف الجہت خوف کو کبھی کبھی محسوس کرتے ہیں، وہ بھی ہمارے حواس اور عقل و فہم کے مختلف ادراکات کی کارفرمائی کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارا ذہن مختلف حالات اور صورتوں کو ملا کر ایک نئی کیفیت یا کیفیات کی شکلیں ترتیب دیتا ہے یا ان کا تصور کرتا ہے۔ لیکن محض تصور ہی کسی خوف کی وجہ نہیں بنتا بلکہ اس کے پیچھے مختلف حالات و کیفیات اور عوامل و عوالم، خوف کی وجہ بن جاتے ہیں۔

تصوف کی نظریاتی تشکیل میں حضرت رابعہ بصری کو ایک کلیدی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ ان نظریات اور عقائد سے ہوسکتا ہے، جن کے حوالے ابو طالب مکی، القشیری اور امام غزالی جیسے صوفیہ و مفکرین نے اپنی تحریروں میں دیے ہیں۔

تصوف تطہیر قلب و نفس اور زہد ہے۔ اس راہ میں مختلف مقامات آتے ہیں۔ تمام خواہشات اور گناہوں کو مٹانے کے بعد سالک مختلف مقامات و احوال سے گزرتا ہے۔ یہ روحانی ارتقا کی ایک طویل اور مشکل داستان ہے جس کی انتہا معرفت الٰہی ہے۔ ان مقامات و احوال پر ابو طالب مکی نے رسالہ قشیریہ اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ توبہ اس کی ابتداء اور رضا اس کی انتہا ہے۔ صبر، شکر، فقر، زہد، توحید، توکل، محبت اور رضا اس کے مختلف مقامات ہیں۔ کچھ صوفیہ بشمول غزالی نے فکر، ذکر، مراقبہ اور احتساب نفس کو بھی ان مقامات میں شامل کیا ہے۔ محبت الٰہی ان مقامات کی انتہا اور مغز ہے۔ محبت میں سالک خدا کے سوا ہر شے اور ہر حال و مقام کو بھلا دیتا ہے اور یوں خدا ہی اس کے ہر عمل کی ابتدا اور انتہا بن جاتا ہے۔ توبہ کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہر شے سے منھ موڑ کر خدا سے لو لگائی جائے۔ حسن بصری اور رابعہ بصری کو گناہوں کے نتائج کا شدید احساس تھا اسی لیے ان کی تعلیمات میں توبہ کو ایک بنیادی مقام حاصل ہے۔ رابعہ کے بارے میں عطاء کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مغموم اور گریہ کی حالت میں ہوتی تھی اور جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اس چیز سے ڈرتی ہوں کہ میں اس سے اور دور نہ جا پڑوں جس سے میں بندھی ہوئی ہوں اور وقت مرگ کہیں یہ آواز نہ آئے کہ میں کسی لائق نہیں۔ محبت کا یہی تصور توبہ، توجہ اور خوف سے مربوط ہے، گناہ ہر وہ عمل ہے جو بندے کو خدا سے الگ کر دے جو روح اور اس کے محبوب (یعنی خدا) میں تفریق ڈال دے۔ رابعہ اسی لیے گناہ سے نفرت کرتی تھیں کہ یہ خدا سے

دور کرتا ہے، نہ کہ اس لیے کہ اس پر سزا دی جائے گی، ایک سالک یا معشوق کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے کہ اس کا عاشق اس سے نظریں پھیر لے اور اسے اپنے سے الگ اور دور کردے۔ توبہ اس کے خیال میں عنایت خدا یا اس کا تحفہ ہے، نہ کہ کوئی ایسی شے جو انسان اپنی محنت سے حاصل کرسکے، ہر انعام اور ہر کمال اسی کی عطا ہے۔ یہی معاملہ شکر کا بھی ہے۔ رابعہ کی زبان پر ہر وقت اللہ کا شکر ہوتا تھا اور شکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر حال میں اس کا شکر ادا کیا جائے۔ خوف اور مصائب و آلام سے شکر کی کیفیت اور زیادہ مستحکم ہونی چاہیے کیونکہ یہ بھی اسی کے عطا کردہ ہیں۔

خوف اور رجا ایمان کی دو بنیادیں اور ایمان کی عمارت کے ستون ہیں۔ ہجویری کے خیال میں سالک جو خدا سے ڈرتا ہے وہ محض اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ کہیں وہ خدا سے دور نہ جا پڑے اور جو اس کی عبادت کرتے ہیں اور امید لگائے رہتے ہیں ان کی آرزو اس سے اتحاد ہے۔ ابوعلی رودباری کا خیال ہے کہ خوف اور رضا ایک پرندے (سالک) کے دو پر ہیں۔ اگر ان میں ایک ٹوٹ جائے تو پرندہ گر جاتا ہے اور اڑنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور اگر دونوں ٹوٹ جائیں تو وہ مر جاتا ہے۔ خوف کے معنی یہ ہیں کہ خوف خدا سالک کے نفس کو ہر شے اور ہر خوف سے آزاد کردے۔ ایک صوفی کا قول ہے کہ خدا سے ڈرنے والا مجسم خوف بن جاتا ہے۔ ہر شے اسے ڈراتی ہے لیکن یہ خوف اسے برباد نہیں کرتا بلکہ یہ اس کے قلب کا تزکیہ کرکے اسے اس کے خالق و مالک و محبوب کی رضا و قرب عطا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی آگ ہے جسے کوئی آگ جلا نہیں سکتی۔ خوف حکمت کی روح ہے اور حکیم وہ ہے جو حکیم میں مل جائے نہ کہ اس سے دور جا پڑے۔ امام غزالی نے بھی خوف کو مہمیز قرار دیا جو سالک کو جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ خوف خدا کا ایک عطیہ ہے جس کا ارشاد ہے کہ سالک اس سے ڈریں۔ یہ روح کو جلا بخشتا ہے کیونکہ یہ خدا کی صفت عدل پر فکر کا نتیجہ ہے۔

خوف، امید اور محبت ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ محبت خوف کے بغیر خالص اور مکمل نہیں اور نہ خوف امید کے بغیر اور نہ امید خوف کے بغیر۔

خوف اور امید صوفیہ کی معادی تعلیمات اور تصور جنت و جہنم سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے خیال میں جہنم ایک دارالعذاب کے بجائے خدا سے دوری اور جدائی ہے اور جنت جائے مسرت کے بجائے دیدار خداوندی اور اس کے ساتھ اتصال کا نام ہے۔

رابعہ بصری کی تعلیمات میں خوف کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس سال عظمت خدا کے احترام میں آسمان کی طرف آنکھیں نہیں اٹھائیں۔ اکثر یہ فرمایا کرتیں کہ جب میں اذان کی آواز سنتی ہوں مجھے روز محشر کی آواز یاد آتی ہے اور جب برف دیکھتی ہوں تو مجھے نامہ اعمال کے اوراق سرسراتے ہوئے نظر آتے ہیں، خوف اور محبت کے متعلق ان کی تعلیمات کا نچوڑ ہے کہ جہنم کے خوف سے یا جنت کی امید میں خدا کی عبادت اولیاء کے لیے بے معنی عمل ہے۔ ان کے خیال میں صرف خدا کی تکریم اور تقدیس مآب ذات اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ تمام امیدوں کا مرکز بھی اسی کی ذات اقدس ہے۔ ان کے خیال میں جنت حسی مسرتوں کے حصول کی جگہ نہیں بلکہ یہ خدا کے دیدار کی حالت ہے۔ جب جنت کے متعلق پوچھا گیا تو کہا پہلے ہمسایہ، یعنی خدا اس کے بعد رہنے کی جگہ۔ امام غزالی کے مطابق ان کے دل میں محبت خدا کے سوا کسی چیز کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ ان کی تعلیمات کا نچوڑ خدا کی بے لوث محبت ہے اور بے لوث محبت کے معنی ہیں مکمل خود سپردگی۔ کیونکہ خود سپردگی نہ ہو تو محبت کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ جو شخص محبت کرتا ہے وہ اپنے محبوب سے محبت کے لیے شرائط طے نہیں کرتا بلکہ اس کے رنگ میں رنگ جانا چاہتا ہے۔ اس کی کسی بات یا حکم سے انحراف کرنے کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آسکتا، اس کے لیے اس کے محبوب کے سوا سب کچھ بے کار و بے معنی ہے۔

یہی حقیقت ''زہد'' سے بھی سامنے آتی ہے۔ زہد انسان کو اللہ کے قریب لے جاتا ہے۔ پاکیزگی انسان کو زہد کی طرف لے جاتی ہے اور زہد محبت خدا کی طرف۔ القشیری نے زہد کے معنی ہر اس شے کو جو روح کو خدا سے الگ کردے، ترک کر دینا بیان کیے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ زہد دنیا اور اس کی ہر شے سے نفرت ہے'' امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ زہد کی تین قسمیں ہیں (الف) حرام کو چھوڑ دینا (ب) حلال کو چھوڑ دینا (ج) اور ہر اس شے کو خدا کے لیے چھوڑ دینا جو روح کو خدا سے دور کردے۔ ترک دنیا توحید کی متقاضی ہے کیونکہ خدا کے بغیر کسی بھی شے کو حقیقی ماننا یا اسے دل میں جگہ دینا ہی شرک ہے جو سب سے بڑا گناہ ہے۔ توحید کے معنی محض خدا کو ایک ماننے کے نہیں ہیں۔ صوفیہ کے نزدیک توحید کے معنی اپنی ذات اور مرضی کو خدا کی مرضی میں گم کر دینا ہے۔ یہی محبت بھی ہے، کیونکہ ہر عاشق اپنی مرضی کو معشوق کی مرضی میں ڈھال دیتا

ہے اور اس کا ہر عمل وہی ہوتا ہے جو محبوب چاہتا ہے اور یہی توبہ کی روح ہے کیونکہ سالک اس کے ذریعہ اپنے قلب سے ہر شے کو مٹا دیتا ہے۔ طہارت کے معنی بھی یہی ہیں کہ انسان اپنے جسم اور روح سے ہر گندگی کو دور کر دے اور وہ لوگ جن کے جسم اور دل نجاست سے آلودہ ہیں، وہ توحید، زہد، توبہ اور خوف و محبت خدا سے محروم ہیں۔ اسی لیے اللہ کے نزدیک مبغوض ہیں۔

یہی حقیقت توکل ہے۔ اسی لیے صوفی توکل کو توحید کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ یہی حضرت رابعہ بصری کی زندگی اور تعلیمات کی اصل ہے۔ انہوں نے دنیا کو مکمل طور پر تج دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ انتہائی حقیر ہے۔ سفیان نے جب ان سے پوچھا کہ خدا سے قربت کے لیے کیا عمل کیا جائے تو فرمایا کہ دونوں جہانوں سے کنارہ کش ہو کر خدا کے ہو جاؤ۔ فرمایا کہ اگر ساری دنیا کی دولت ایک انسان کو دی جائے جب بھی وہ دولت مند نہیں، کیونکہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ خدا کی محبت میں وہ اس بات سے بھی خائف تھیں کہ ان کا شہرہ بزرگ یا ولیہ کی حیثیت سے ہو جائے، کیونکہ اس سے ان کے دل میں خدا کے سوا یہ دوسری شے بھی سما جائے گی۔ وہ فرماتی تھیں کہ اپنی نیکیوں کو برائیوں کی طرح چھپا دو ورنہ یہ تمہارے دل کو آلودہ کر دیں گی۔ یہی حقیقی محبت ہے اور اس کی انتہا خدا کی ذات سے اتصال ہے اسی لیے صوفیہ کے نزدیک محبت سب مقامات میں سے انتہائے درجہ کی غایت اور سب میں بلند مرتبہ کی حامل ہے۔ باقی سب مقامات اس کے مقدمات ہیں۔ محبت ہی شرط ایمان ہے اور محبت ہی انتہائے ایمان۔ اسی لیے ہرم بن حیان نے فرمایا کہ صاحب ایمان جب اپنے رب کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے اور جب محبت کرتا ہے تو اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب اس توجہ کا مزہ پاتا ہے تو دنیا کی طرف خواہش کی نظر سے نہیں دیکھتا نہ آخرت کی طرف کاہلی کی نظر سے۔ اپنے جسم سے تو دنیا میں رہتا ہے اور روح سے آخرت میں۔ اسی لیے حضرت رابعہ بصری نے ایمان کو خدا کی بے لوث محبت سے مشروط کر دیا اور جب ان سے جنت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا **الجار ثم الدار** یعنی اول صاحب خانہ پھر خانہ۔ یعنی میری محبت مالک جنت سے ہے جنت سے نہیں اور مالک جنت سے محبت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کے سوا ہر شے دل سے معدوم ہو جائے۔ یہ خوف کی وہ باریک شکل ہے جو محبت کی روح ہے۔

تصوف کے نظری ارتقا پہ بہت ہی سنجیدگی، متانت، غیر جانب داری اور گہرائی سے غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ اسلام کی روحانی تعلیمات کے تحفظ، انسانیت کے بقا اور جبر کے خلاف ایک مربوط آواز تھی اور تمام حقیقی صوفیہ جن کے سرخیل خواجہ حسن بصری اور حضرت رابعہ بصری ہیں کی انسانی تاریخ اور نفسیات پر بہت ہی گہری نظر تھی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صوفی نفسیات کی جڑیں قرآن اور سنت نبوی میں بہت گہرے طور پر جڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے انسانی نفسیات کو سمجھنے اور برتنے اور اسے صحیح نہج پر ڈالنے کے لیے جو بھی رویہ اختیار کیا وہ قرآنی تعلیمات اور سنت نبویؐ سے مربوط ہے۔ حضرت حسن بصری نے خوف کی نفسیات اور حضرت رابعہ بصری نے محبت کی نفسیات کو پیش کیا اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ خوف کی بنیاد ہمیشہ محبت میں پیوستہ ہوتی ہے اور محبت ہمیشہ خوف کو پیدا کرتی ہے اور اسے بڑھاوا دیتی ہے۔

اس زمانے کی اسلامی دنیا کے سیاسی و سماجی حالات، تہذیبی رفتار اور اس کی تنظیم و اقدار جو اسلام کی روح اور اساسی اصولوں سے بہت دور جا پڑے تھے، ایسے حالات میں ایک مثبت اور حرکی تبدیلی کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اسلامی فلسفۂ حیات، اس کی اقدار اور تصورات کی از سر نو ایک زندہ فلسفیانہ اور نفسیاتی توجیہہ و تشریح کی جائے، تاکہ اسلامی تہذیب کو اس تباہی سے بچایا جا سکے جو مسلمان حکمرانوں اور امت کی بداعمالیوں کا نتیجہ تھی اور عذاب الٰہی کو دعوت دے رہی تھی۔

اسلامی دنیا کے حکمرانوں اور ان کے کارندوں کو جو اپنے حقیر سیاسی و معاشی مفادات کے لیے انسانی اور اسلامی اقدار کو روند رہے تھے اور فلسفہ جبر کی تبلیغ کے ذریعہ اپنے جرائم کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، ان کو روکنے کے لیے حسن بصری نے اللہ کے خوف کا تصور پیش کیا تاکہ اس کے ذریعہ ان کی روح کو جھنجھوڑا جا سکے اور انہیں ان کی بداعمالیوں سے بچایا جا سکے۔ حضرت رابعہ بصری کا کردار اس حیثیت سے بڑا اہم ہے کہ انہوں نے محبت کے تصور کو پیش کر کے خوف کی نفسیات کو نئی زندگی، گہرائی اور جہتیں عطا کیں۔ کیونکہ یہ محبت ہی ہے جو ابراہیمؑ کو آگ میں کودنے، محمدؐ کو بدر میں جانے اور حسینؓ کو اپنے اہل بیتؓ کے ساتھ کربلا میں اتار دیتی ہے۔ محض خوف انسان کو حتمی اقدامات اٹھانے پر مجبور نہیں کرتا لیکن جس خوف کی جڑیں محبت الٰہی میں پیوستہ

ہوتی ہیں وہ محبت کی ایک نئی قوی اور مثبت شکل ہوتی ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

صوفیہ کی انسانی نفسیات پر بڑی ہی گہری نظر تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ انسانوں کے قلوب کی تسخیر نہ کرتے۔ کیونکہ ایک انسان کو بڑے مقصد کے حصول اور جدوجہد کے لیے تیار کرنا، تمام برائیوں سے روکنا اور نیکیوں کی طرف راغب کرنا کسی ایسے شخص کے لیے ممکن ہی نہیں جس کی انسانی نفسیات اور زمانے کے حالات پر گہری نظر نہ ہو اور جو انہیں اپنے نظریات کے مطابق ڈھال نہ سکے۔

تصوف کے بنیادی تصورات میں خوف اور محبت کو ایک کلیدی اور اساسی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تصورات حضرت حسن بصری اور حضرت رابعہ بصری جیسی عبقری شخصیات نے پیش کیے۔ ان کو یوں ہی نہیں لیا جا سکتا جیسا کہ اب تک کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تصورات کی اپنی دینیاتی، الٰہیاتی، مابعد الطبیعی، اخلاقی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ ان کا تعلق انسان کی بنیادی نفسیات سے بھی ہے اور نفسیاتی کوائف وعوالم سے بھی۔ ان تصورات کو سطحی طور پر دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام غزالی کی محبت اور خوف سے متعلق فلسفیانہ آراء پر اب تک گہرائی سے غور ہی نہیں ہوا۔

ان دونوں تصورات کی جڑیں کلام الٰہی اور حدیث نبویؐ میں پیوستہ ہیں۔ کلام پاک کا سارا ابتدائی یا مکی حصہ خوف اور مدنی دور کا محبت اور خوف کے تصور کو نہ صرف ایمان اور دین کی بنیاد بنا کر پیش کر رہا ہے، بلکہ انہیں انسان کی دونوں جہانوں میں کامیابی کی شرائط کے طور پر سامنے لا رہا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ تصورات محض فرد یا انفرادی زندگی کی تطہیر و تزئین نہیں کرتے بلکہ اس کی پوری مدنی زندگی کو آراستہ اور ایک فلاحی اور تخلیقی تہذیب کی صورت گری کرتے ہیں اور اس طرح اس کے خدا کا حقیقی خلیفہ بننے کی راہ استوار و متعین کر دیتے ہیں۔

بنیادی ماخذ

(۱) قرآن حکیم۔ (۲) تراجم وتفاسیر۔ سید قطب شہید فی ظلال القرآن، جلد اول و دوم۔ امین احسن اصلاحی تدبر قرآن۔ عبداللہ یوسف علی انگریزی ترجمہ وتفسیر۔ (۳) اقبال تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ۔ (۴) جنید بغدادی رسالہ توحید۔ (۵) دہلوی شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ، خیر کثیر۔ (۶) غزالی احیاء العلوم، کیمیائے سعادت المنقذ من الضلال، تہافۃ الفلاسفہ۔ (۷) قشیری رسالہ قشیریہ۔ (۸) شریف، ایم۔ ایم دی ہسٹری آف مسلم فلاسفی۔

عصر حاضر کے امام ابوحنیفہ
پروفیسر مصطفیٰ زرقاء
(۱۹۰۴ء-۱۹۹۹ء)

پروفیسر محمد راشد ندوی

دسمبر ۱۹۵۵ء، ہم دمشق پہنچے، موسم بہت خوش گوار تھا اور ہمارے لیے تھوڑا باعث پریشانی، ہر طرف برف باری ہورہی تھی لیکن دمشق شہر میں جس ہوٹل میں ہمارے لیے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا وہ ایر کنڈیشن تھا، شیشے کی کھڑکیوں سے ہم باہر کے نظارے سے لطف اندوز ہورہے تھے لیکن باہر نکلنے کی ہمت بالکل نہیں ہورہی تھی، تقریباً دوروز تک مستقل ہوٹل میں رہے، اس کے بعد کلیۃ الشریعۃ دمشق یونیورسٹی کے کچھ ذمہ دار ہمارے پاس آئے اور انہوں نے ہم سے کہا کہ آج یونیورسٹی میں داخلے کی کارروائی مکمل کر لیجیے، کیونکہ اب کلاسیں شروع ہوچکی ہیں، کلیۃ الشریعۃ میں ہمارا داخلہ ہونا تھا یہ کلیۃ (فیکلٹی) دوسال پہلے ۱۹۵۴ء میں وجود میں آئی تھی جس کو شام کے مذہبی فکر کے لوگوں نے بڑی جدوجہد کے بعد قائم کروایا تھا کیونکہ شام کی حکومت اس وقت سیکولر ذہن کے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے لوگوں کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ قائم ہونے سے کمیونل فیلنگ بڑھے گی اس لیے اس کا نہ قائم ہونا زیادہ بہتر ہے، اس فیکلٹی کے قائم کرنے کی جدوجہد پروفیسر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کررہے تھے جو اس وقت شام حلقہ کے اخوان المسلمین کے مرشد عام (صدر) تھے اور شام کے علمی حلقے میں ان کو بہت ہی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اخوان کے مرشد عام ہونے کی وجہ سے وہ کافی

سابق صدر شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

بااثر اور فعال بھی تھے، اس لیے مذہبی خیال کے تمام لوگ دل و جان سے ان کے ساتھ تھے اور اس فیکلٹی کے قائم کرنے کے لیے ان کا دباؤ حکومت پر کافی تھا۔

بالآخر یہ فیکلٹی وجود میں آئی اور اس کا نصاب تعلیم بہت ہی جامع، مناسب مرتب کیا گیا اور ہر فن کے اساتذہ اور علماء سے ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، نصاب تعلیم میں دینیات سے متعلق تمام موضوعات شامل تھے مثلاً اسلامی تاریخ، فقہ، حدیث، تفسیر اسلامی علوم کی تاریخ، اسلامی ثقافت کی تاریخ، جدید قوانین، سیاسیات جیسے موضوعات جو شریعہ کے لیے بنیاد ہیں، نصاب تعلیم میں شامل کیے گئے اور ان اساتذہ میں پروفیسر محمد المبارک، پروفیسر محمد الدوالیبی، شیخ علی الطنطاوی (جج سپریم کورٹ)، شیخ بہجۃ البیطار اور علامہ پروفیسر مصطفیٰ زرقاء تھے، مصطفیٰ زرقاء اس وقت فیکلٹی آف لا (لا کالج) میں اسلامی فقہ کے استاذ تھے اور بلاد عربیہ میں اسلامی فقہ کے قدیم مراجع اور جدید قانون کے مسائل پر انہیں غیر معمولی قدرت تھی اور انہیں اس فن میں امامت کا مرتبہ حاصل تھا کیونکہ بلاد عربیہ میں اس وقت تین شخصیتیں ایسی تھیں جنہیں عام اسلامی قانون اور خاص پرسنل لا (احوال شخصیہ) میں غیر معمولی قدرت تھی، مصر میں شیخ ابوزہرہ، لبنان میں استاذ شنھوری کا نام نامی صفحہ اول میں تھا، دسمبر ہی کے کسی تاریخ میں ہم یونیورسٹی میں تھے وہاں یہ پتہ چلا کہ آج شیخ مصطفیٰ زرقاء کی کلاس ہے اور یہ پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ جدید اسلامی فقہ کے استاد کی حیثیت سے انہیں کلیۃ الشریعۃ میں رکھا گیا ہے، جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آج ان کی کلاس ہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کلاس روم میں چلے گئے، تھوڑی دیر کے بعد مصطفیٰ زرقاء تشریف لائے، ان کو دیکھ کر ایسا لگا کہ وہ علم و عرفان کے مجسمہ ہیں۔ لمبا قد، کھلا ہوا گیہواں رنگ، سر پر گھنے بال، عمدہ سوٹ اور ٹائی، شدید سردی کی وجہ سے لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھے، شام میں دو شہر مشہور ہیں ایک دمشق اور دوسرا حلب، دونوں شہروں میں ہمیشہ منافست اور مسابقت کا ماحول رہتا ہے اور دونوں جگہ کے لوگوں کو اپنے شہر پر ناز اور فخر رہتا ہے۔ اتفاق سے دونوں شہر کے لہجوں میں بھی تھوڑا فرق ہے ہوسکتا ہے کہ اس میں آب و ہوا کا دخل ہو۔

دمشق شہر پھلوں اور پھولوں کا گہوارہ ہے، دریائے بردہ کا پانی اس کے لیے آب حیات ہے اور اس کی برکت سے ہر گھر میں پانی کی فراوانی رہتی ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے دمشق کے

لوگوں کے لیے لازوال نعمت ہے، دمشق والوں کا لہجہ نرم و نازک ہوتا ہے اور اس کے مقابل میں حلب والوں کا لہجہ کھڑا، کیونکہ وہاں صرف پہاڑ ہی پہاڑ ہیں، بہر کیف دونوں لہجوں کی الگ الگ شان ہے جس کو کہتے ہیں ایک کے لہجہ میں امالہ ہے اور دوسرے کے لہجے میں اکھڑ پن ہے۔

زرقاء نے جب اپنی گفتگو شروع کی تو پہلے ہم ان کی شکل سے ہی مرعوب تھے اور جب گفتگو شروع کی تو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے فن کے امام ہیں اور موضوع کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی انہیں اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل ہے۔ ۱۹۵۶ء سے پہلے وہ یوروپ کے دو بڑے ملکوں ہالینڈ اور فرانس کے دو سمیناروں میں شرکت کے لیے شامی حکومت کی طرف سے بھیجے گئے تھے، ہالینڈ میں سمینار کا موضوع اسلامی فقہ کے اصول و مراجع تھا اور فرانس میں مختلف مذاہب کا پرسنل لا تھا۔

پہلے دن مصطفیٰ زرقاء کا لیکچر اسلامی فقہ کے اصول و مراجع اور اس کی عالمی حیثیت سے کیا معیار ہے اس پر گفتگو کی، ان کے لیکچر کی بنیادی فکر یہ تھی کہ اسلامی فقہ جو ۱۴سو سال کے عرصہ میں مختلف مراحل سے گذرا ہے، جس میں سیکڑوں فقہاء اور علماء کی کاوشیں شامل ہیں، ان کا مجموعی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت ہمیں اصول و ضوابط مل سکتے ہیں، جس کی روشنی میں عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت جدید فقہ کے اصول و ضوابط مرتب کر سکتے ہیں لیکن اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ سینکڑوں علماء و فقہاء کی کاوشوں کا ایک وحدت کی حیثیت سے مطالعہ کریں اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق دور حاضر کے مسائل کا حل تلاش کریں اور اسی کی روشنی میں ہم اجتہاد و قیاس کے دروازے کو کھولیں اور خدا نے جو ہمیں صلاحیت عطا کی ہے اس میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ انسانی فکر میں کبھی جمود نہیں رہا ہے تو علم میں بھی جمود نہیں ہونا چاہیے اور علم میں بھی حرکت و توانائی عقل و فکر کی بدولت حاصل ہوتی ہے تو قدرت کی طرف سے ہر انسان کو عقل و فکر کی نعمت حاصل ہے، اس لیے اس کو نہ استعمال کرنا اور نہ فائدہ اٹھانا اللہ کی بڑی نعمت سے محروم رہنا ہے، ایک گھنٹہ کا یہ لیکچر تھا اور اس وقت ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ ہمیں اسلامی فقہ کی مالہ و ماعلیہ کی واقفیت حاصل ہوئی ہے اور اس وقت جو ہم میں انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہوئی وہ ہم بیان نہیں کر سکتے، ہمیں بڑی خوشی ہے کہ ہمیں عصر حاضر کے امام ابوحنیفہ پروفیسر مصطفیٰ زرقاء پر گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

پروفیسر مصطفیٰ زرقاء ۱۹۰۴ء میں حلب میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ احمد بن محمد الزرقاء کا حلب کے مشہور و معروف علماء میں شمار ہوتا تھا، فقہ حنفی کے باریک سے باریک مسائل پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان فقہ حنفی کے شارح اور ترجمان کی حیثیت سے مشہور تھے اور یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کی حکومت عرب ممالک سے لے کر شمال افریقہ کے اسلامی ممالک اور حجاز کے ساتھ ساتھ خلیج عرب کے تمام امارات پر شامل تھی یعنی خلافت عثمانیہ کا جھنڈا ان تمام علاقوں پر لہرا رہا تھا اور کسی کے ذہن میں یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ یہ لہلہاتا ہوا جھنڈا سرنگوں ہوگا، خلافت عثمانیہ کی طویل تاریخ میں عروج و زوال تو ضرور آیا لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی شمعیں کسی دور میں بالکل ہی بجھ گئی تھیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی عروج و زوال کے ساتھ ساتھ علم و عرفان کا قافلہ بھی رواں دواں رہا اور علماء و محققین کی کاوشیں اپنے اپنے انداز میں ہر علاقہ میں جاری و ساری تھیں، تصنیف و تحقیق کے ساتھ ساتھ علوم کی تدوین پر لوگوں نے غیر معمولی محنت کی تھیں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ قدیم علماء کی محنتوں و کاوشوں کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو یہ تو معلوم رہے کہ ان کے آباء و اجداد نے علم و عرفان کے سلسلے میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، شیخ محمد زرقاء جن کے بارے میں ابھی عرض کیا گیا ہے وہ فقہ حنفی کے امام مانے جاتے تھے اور اس وقت جو دولت عثمانیہ کا دستور تھا جس کو المجلہ کے نام سے جانا جاتا ہے، المجلہ میں جو اصول مرتب ہوتے تھے اس کا بنیادی ماخذ فقہ حنفی تھا اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ زیادہ تر عجمی ممالک میں فقہ حنفی کا رواج زیادہ تھا۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء کے والد احمد زرقاء کی حیثیت اس وقت عثمانی دستور کے شارح کی حیثیت سے اہل علم کے حلقہ میں جانی جاتی تھی اور ان کو بہت ہی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، دستور کے شارح اور محقق کی حیثیت سے احمد زرقاء کو امامت کی حیثیت حاصل تھی، اس طرح مصطفیٰ زرقاء نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں صرف علم ہی کا چرچا تھا، چنانچہ ان کے والد نے محلّہ کے مکتب میں داخلہ کرا دیا اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید طرز کے اسکول میں بھی داخلہ لے لیا، اس طرح ان کی تعلیم کا سلسلہ جدید و قدیم دونوں کے ساتھ ساتھ جاری رہا اور یہ کہا جائے کہ وہ شروع ہی سے مجمع البحرین تھے، جدید اسکول میں داخلہ لینے کی وجہ

سے انہیں جدید علوم کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان کو پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا اور ہائر سکنڈری کی سند دونوں طرز کے اسکولوں سے حاصل کی۔ جدید طرز کے اسکول میں داخلہ سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کے لیے دروازے کھلے رہیں، چنانچہ ثانویہ عامہ (انٹرمیڈیٹ) کے بعد انہوں نے دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الحقوق (لا کالج) اور کلیۃ الآداب (فیکلٹی آف آرٹس) دونوں میں ایک ساتھ داخلہ لیا، اس وقت دو فیکلٹی میں داخلہ لینے کی اجازت تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصطفیٰ زرقاء کو شروع سے ہی علم سے کتنا لگاؤ تھا اور دو فیکلٹی میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنا اور دونوں میں امتیازی پوزیشن حاصل کرنا آسان کام نہ تھا لیکن محنت اور دھن کے آگے مشکل سے مشکل راہیں آسان و ہموار ہو جاتی ہیں اور راہی بڑی آسانی سے اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے، اسلامی شریعت، جدید قانون، زبان و ادب پر قدرت حاصل ہونے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۰ء میں حلب میں وکالت شروع کی اور عام طور سے وکالت کے پیشے میں قانونی واقفیت کے ساتھ ساتھ اگر وکیل کو زبان پر مہارت و قدرت حاصل ہے تو وہ بڑی آسانی سے اس پیشہ میں بھی کامیابی حاصل کر لیتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے کہ مصطفیٰ زرقاء وکالت کے پیشہ سے بہت زیادہ مطمئن نہیں تھے، چنانچہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ قاہرہ روانہ ہوگئے اور جامعۃ الفواد (موجودہ جامعۃ القاہرۃ) فیکلٹی آف لا کے اسلامک لا میں ڈپلومہ میں داخلہ لیا تا کہ اپنے علمی سفر کو اور آگے جاری و باقی رکھ سکیں، جامعۃ القاہرہ سے اسلامک شریعہ میں ڈپلومہ کی سند حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے وطن حلب واپس ہوئے یہاں ان کو آیندہ کے لیے پلاننگ کرنی تھی، اتفاق سے دمشق یونیورسٹی میں فیکلٹی آف لا اسلامی فقہ کے استاذ کی جگہ خالی تھی جہاں انہوں نے درخواست دی اور ان کا تقرر ہو گیا اور ایسا لگتا ہے کہ جامعہ میں تقرری کے بعد ان کے لیے علم کی تمام شاہراہیں کھل گئیں اور ان کی خواہش کے مطابق منزل متعین ہوگئی، دمشق یونیورسٹی سے انہوں نے علم کی راہیں اس طرح سے ہموار کرنا شروع کیں، جیسے کسی عاشق کو معشوقہ کی رسائی میں منزل کی ہر کاوش میں مزا و لطف آتا ہو اور سفر کے ہر لمحہ کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا ہو۔

مصطفیٰ زرقاء دمشق یونیورسٹی میں ایک کامیاب استاذ اور ماہر قانون کی حیثیت سے معروف ہوگئے، تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تحقیق کے میدان میں بھی غیر معمولی محنت

شروع کی اور ایسا لگتا ہے کہ ان کو دھن تھی کہ اس میدان میں امامت کا مرتبہ حاصل کریں، یوں تو مصطفیٰ زرقاء اسلامی قانون کے استاذ تھے لیکن اسلامی قانون میں جلا و مہارت اسی وقت حاصل ہو سکتی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں دنیا کے جتنے قوانین ہیں ان کا بھی گہرا مطالعہ کیا جائے کیونکہ اس وقت فیکلٹی آف لا میں جتنے موضوعات کی تعلیم و تدریس تھی، ان کے بنیادی اصول و ماخذ مغربی قانون و فقہ تھے اور یہ دمشق یونیوسٹی نہیں بلکہ اس وقت دنیا کی جتنی یونیورسٹیاں تھیں زیادہ تر ان میں مغربی فقہ و قانون کو بنیاد بنایا گیا تھا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغربی ممالک میں جو بھی مضامین و موضوعات و طریقہ تدریس و تعلیم تھا اسی کی نقل تمام تر مشرقی ممالک میں کی گئی تھی اور اسی طریقہ تعلیم کو معیار تصور کیا جاتا تھا۔ بہرکیف مصطفیٰ زرقاء نے اپنے اسلامی قانون کے سلسلے میں اسلامی قانون کے قدیم مراجع و مصادر کا بہت ہی محنت و جانفشانی سے مطالعہ کیا اور اسی محنت و لگن کے ساتھ ساتھ فقہ کے جدید موضوعات و مضامین کے مطالعہ کو باقی و جاری رکھا اور اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلامی فقہ کو نئے انداز میں عصر حاضر کے تعلیمی حلقہ میں تعارف کرائیں اور لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈالیں کہ اسلامی تاریخ میں اسلامی قانون کی بنیاد ہمیشہ تقلید نہیں رہی ہے بلکہ ہر دور میں علماء نے زمانہ کے لحاظ سے مسائل پر گفتگو کی ہے لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ان کی کوششوں سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں بلکہ چند فقہاء اور خاص طور سے وہ چار مدرسے جو فقہی مدرسے یعنی مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی کے نام سے مشہور ہیں، اس کے دائرہ میں محدود کر رکھا ہے بلکہ بہت سے متشددین ان میں سے ایک ہی فقہ کو قبول کر لیتے ہیں اور اس فقہ کے امام کی رائے کے علاوہ کسی اور امام کی رائے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس طرح امت کا ایک بہت بڑا طبقہ دوسری فقہ کے آراء سے محروم ہو جاتا ہے اور ہر طرف تقلید ہی تقلید کا دور دورہ ہوتا ہے اور مقلد و غیر مقلد کی بحث شروع ہو جاتی ہے، شیخ مصطفیٰ زرقاء نے اس طرز فکر کو حل کرنے کی کوشش کی اور علم و عرفان کی شمعیں جہاں بھی جل رہی ہوں ان سے استفادہ کی تلقین و ترغیب دینی شروع کی، اور باہمی جھگڑوں کے ختم کرنے کی دعوت دی، مصطفیٰ زرقاء کے تعلیم و تدریس کا یہ سلسلہ دمشق یونیورسٹی فیکلٹی آف لا اور بعد میں کلیۃ الشریعہ دونوں میں رہا اور ایک کامیاب محقق و مدرس کی حیثیت سے ہر دل عزیز ہوئے۔

۱۹۶۶ء تک وہ دمشق یونیورسٹی میں تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے اور دمشق یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد ان کے علم کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے علمی تجربے کو ہمیشہ کارآمد بنایا اور علم کی دھن ہمیشہ ان کے دل و دماغ میں رہی اس شعر کی طرح

مکتب عشق کا انداز نرالا پایا
چھٹی اس کو نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ علاقہ جہاں مصطفیٰ زرقاء نے آنکھ کھولی تھی اور ترقی کی راہوں کو ہموار کیا تھا سیاسی بدحالی کا شکار رہا، حکومت اور عوام میں ذہنی تال میل نہ ہونے کی وجہ سے علماء اور محققین کا ایک بڑا طبقہ حالات سے پریشان و بدظن ہو کر ملک سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوا۔

عام طور سے جدید ذہن کے لوگوں کے اندر یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے کہ کسی ملک کی ترقی کا دارومدار یا اس کا اعلیٰ معیار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کوئی ملک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی سو فیصد تقلید نہ کرے اور وہ تقلید ایک سمت میں نہ ہو بلکہ اس کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا اتنا ہی ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے اور یہ تقلید چاہے نصاب تعلیم میں ہو یا نظام حکومت میں ہو، قانون یا فقہ میں ہو، سیاسی یا سماجی زندگی میں ہو یہاں تک کہ روزمرہ کی زندگی میں ہو، جب عام طور پر یہ تصور جتنا پختہ ہوتا جاتا ہے اپنے ملک کی ماضی کی اعلیٰ قدروں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، بلکہ ماضی کی ہر اچھی چیز کو کم تر سمجھا جانے لگتا ہے جس طرح ملک کا ڈھانچہ ظاہری طور پر چمکتا ہوا نظر آتا ہے اندر سے بے جان ہو جاتا ہے اور یہ ظاہری چمک ملمع سازی کی مرادف ہوتی ہے اس نقطہ نظر سے ہم اس ملک کا جائزہ لیں جس میں شیخ مصطفیٰ زرقاء پیدا ہوئے تھے اور زندگی کے اچھے دن اس میں گذارے تھے، راقم الحروف کو تقریباً تین چار سال شام میں رہنے کا موقع ملا اور اس کے ہر خطے میں جانے کی سعادت حاصل ہوئی، عوام کے ہر طبقے سے ملاقات اور ان سے بات چیت کے مواقع حاصل ہوئے اس وقت میرے ذہن میں یہ چیز بار بار آئی تھی کہ اللہ نے اس ملک کو کتنی نعمتوں سے نوازا ہے، یہاں کی زمین زرخیز، عوام میں سنجیدگی اور حوصلہ ہے، ہر طبقے میں محنت اور جفاکشی کی لگن ہے اور سب سے بڑی بات ذہنی فکری توازن ہے، لوگوں کے درمیان سیاسی و سماجی مسائل میں اختلاف کچھ ضرور ہیں لیکن وہ بھی حدود کے دائرے میں، اس طرح سے باہمی اختلافات

قومی ترقی کی علامت ہیں، جس زمانے میں راقم الحروف کا وہاں قیام تھا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہاں چھوٹے اور بڑے کا کوئی فرق نہیں اور صحیح معنوں میں جمہوری نظام قائم ہے اور جب بھی اس خطے میں کسی عہدہ کے لیے انتخاب یا الیکشن ہوتا ہے کہیں بھی بے ایمانی و بدنیتی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا لیکن بدقسمتی سے مصر و شام میں اتحاد کے بعد جب انتشار آیا اس وقت اس ملک نے ایک سیاسی کروٹ لی اور اسی دن سے جمہوری قدریں ختم ہونے لگیں اور عوام میں بے چینی و بدحالی کی فضا قائم ہوئی، بدقسمتی ہے کہ اس بدحالی کی فضا میں بجائے کمی آنے کے روز بہ روز اضافہ ہوتا رہا ہے اور آج ایسا لگتا ہے کہ اس ملک کے ہر خطہ میں لوگ خون کی ہولی کھیل رہے ہیں اور سارا ملک بدحالی میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا؟ جو ملک حسن و جمال کا مرقع تھا وہ روز بروز ویران اور اجڑتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور ملک کا دانشور طبقہ اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو رہا ہے اور اس میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ملک سے ایک لمحہ جدائی گوارہ نہیں کر سکتے آج وہ ملک بدر ہیں اور دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔

شیخ مصطفیٰ زرقاء جن کو بڑی لمبی عمر نصیب ہوئی تھی اور جب تک وہ دمشق یونیورسٹی میں استاذ کی حیثیت سے کام کرتے رہے، بہت ہی خاموش اور سکون کے ساتھ علم و تحقیق کی آسان و مشکل دونوں راہوں کو اپنی ہمت و حوصلہ و شوق و جوش سے طے کرتے رہے لیکن جیوں ہی یونیورسٹی سے سبک دوش ہوئے اور وہ وقت ایسا تھا کہ اپنے ملک میں اپنے گھر کے ایک گوشے میں اپنی تحقیق و تصنیف کا سلسلہ جاری رکھتے لیکن بدقسمتی سے ان کو بھی اپنے ملک میں خاموشی سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اور اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، عجب اتفاق ہے کہ شام کے چند علماء و محققین جو ملک شام ایک لمحہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے ان میں حلب میں مصطفیٰ زرقاء، دمشق میں علی طنطاوی اور محمد المبارک یہ وہ لوگ تھے جنہیں ملک شام کے ذرہ ذرہ سے لگاؤ تھا اور شام کا حسن و جمال ان کی آنکھوں میں اس قدر رچا بسا ہوا تھا کہ اس کے علاوہ دنیا کی کوئی چیز ان کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کر سکتی تھی لیکن شاعر کا یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔

غــربة الـفـكــر فـی دار تـمـجـدهـا
أتـقــی عـلــی الـحــرمـن فقدان نـاظـره

کہاں دمشق، کہاں حلب جن کے در و دیوار سے علم و معرفت کی خوشبو آتی تھی آج اس کے پروانے وشیدائی قطر، کویت، نجد و حجاز میں پناہ گزیں کی حیثیت سے زندگی کاٹ رہے ہیں۔

مصطفیٰ زرقاء کو فقہ و قانون کے میدان میں عالمی شہرت حاصل ہوچکی تھی، دنیائے عرب کے ہر علاقہ میں انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کی امامت اور استاذیت علماء و محققین کے درمیان بالکل مسلم، اس لیے ہر ملک میں انہیں عزت و احترام حاصل تھا اور کسی نہ کسی بہانے سے انہیں ملک میں علم و تحقیق کے مرکزوں میں اعلیٰ مقام دے کر نوازا گیا تھا، کہیں علمی و فقہی اکیڈمی کے ڈائرکٹر، کہیں کسی ملک میں وزارت قانون و وزارت فقہ کے کسی اعلیٰ مرکز میں (ایڈوائزر) اور اس میں شبہ نہیں کہ ان ملکوں کی بڑی سعادت ہے جنھوں نے اپنے ہاں مصطفیٰ زرقاء کو اعلیٰ مقام دیا اور ان کے علم و عرفان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مصطفیٰ زرقاء کے آخری دن قطر و کویت اور سعودیہ عربیہ کی علمی و فقہی اکیڈمیوں کے درمیان گذرے اور خود مصطفیٰ زرقاء جہاں بھی رہے ان کی یہی خواہش و کوشش رہی کہ وہ جہاں بھی رہیں وہاں کے لوگوں کو اپنے علم و تجربہ سے فائدہ پہنچاتے رہیں، اگر ہم مصطفیٰ زرقاء کی زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ بات صاف نظر آئے گی کہ اگر وہ اپنے ملک میں ہوتے اور ان کا ملک ان کی عظمت اور ان کی علمی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتا تو جتنا مصطفیٰ زرقاء کے اندر صلاحیت تھی وہ اور نکھرتی علمی میدان میں کسی محقق و عالم کی جتنی قدردانی ہوتی ہے اتنا ہی اس کا حوصلہ بڑھتا رہتا ہے اور لوگ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مصطفیٰ زرقاء کے علمی و فنی خدمات کا جائزہ لیا جائے جو بہت زیادہ پھیلے ہوئے نہیں ہیں لیکن ان میں فکر و معرفت اور مجتہدانہ طریقہ کار نظر آتا ہے اور اسلامی ملک کے محققین کہیں ان کو ''الملکہ للفقہیہ'' کہیں ان کو سلسلہ شرعیہ ذہبیہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں، علی طنطاوی ان کے اور ان کے خاندان کے بارے میں فقہیہ شرعیہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور شیخ مصطفی السباعی ان کو ملکۃ فقہیہ یعنی فقہ پر ان کو ملکہ حاصل ہے، جب کہ وہ شیوخ ابوزہرۃ کو مکتبۃ فقہیہ کے لقب سے نوازتے ہیں یعنی فقہ و قانون کے چلتے پھرتے کتب خانہ، راقم الحروف کو مصطفیٰ زرقاء سے براہ راست شاگردی کا موقع ملا تھا اور ان کی تمام تصانیف کو غور سے پڑھنے کی سعادت حاصل

ہوئی تھی خاص طور سے ان کی کتاب ”الفقہ الاسلامی فی ثوب جدید“ ، ” الاستصلاح والمصالح المرسلۃ “ ، ” احکام البنوک والترکات“ اور مجموعہ فتاوی ”الحدیث النبوی“ ، ان کتابوں میں جہاں مصطفیٰ زرقاء ایک محقق و مجتہد کی حیثیت سے نظر آئے وہیں وہ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے نظر آئے ، عام طور سے فقہاء اور مجتہدین کا اسلوب ثقیل ہوتا ہے ، چند ہی فقہاء ایسے ہیں جن کی کتابوں میں اجتہاد و تحقیق کے ساتھ ساتھ ان میں ادبی رنگ بھی نمایاں ہوتا ہے ، اس سلسلے میں امام شافعی اس طرز کے فقہاء کے امام اور خاص طور سے اپنی کتاب ”کتاب الام“ میں نظر آتے ہیں ، جدید دور میں مصر کے محقق و مجتہد شیخ ابوزہرہ کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے اور ان کی کتابیں امام مالک ، امام ابو حنیفہ ، امام شافعی ، ابن حنبل ، ابن حزم جنہیں اس دور میں تمام عرب ممالک میں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور نہ معلوم کتنے لوگ ان کی کتابوں کو پڑھ کر مصنف و محقق بن گئے اور میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عربی نثر نگاری میں جن مصنّفین کی تصانیف نے میرے اندر علم و ادب کا حوصلہ پیدا کیا ان میں میں شیخ مصطفیٰ زرقاء ، شیخ ابوزہرہ ، عباس محمود العقاد خاص طور سے عبقریات ، احمد امین کی تمام تصانیف اور سید قطب اور ان کی ” العدالۃ الاجتماعیۃ ، شاھد القیامۃ فی القرآن ، التصویر الفنی فی القرآن ، فی ظلال القرآن“ اور علامہ محمود شاکر کی حیاۃ المتنبی من شعرہ ، الطریق الی ثقافتنا ، اباطیل و اسمار ، الظاھرۃ القرآنیۃ کا مقدمہ ، یہ کتابیں ایسی ہیں جنہیں علمی عربی زبان کے خزانہ میں ایک غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی روح کو خوش رکھے اور ان کی علمی خدمات سے ہر طریقے سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دے۔

۱۹۹۹ء کا سال اسلامی ملکوں کے لیے رنج و الم کا سال ہے ، اس میں کچھ ایسی شخصیتیں جو عرب ممالک کے آسمان بلکہ اسلامی دنیا کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہی تھیں ، دنیا ان کی روشنی سے محروم ہوگئی اور اجالے کے بعد تاریکی کا منظر عام طور سے دل و دماغ کی طاقت اور توانائی کو ختم کر دیتا ہے اور امید و بہار کے بجائے مایوسی ہی مایوسی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے

اورمسافرکا یہ شعر

سیفقدنی قوی اذا جد جدھم
وفی لیلة ظلماء یفتقد البدر

اسی سال سعودی عرب کے سرزمین میں شیخ مصطفیٰ زرقاء، علی طنطاوی، حمد الجاسر اور سعودی عربیہ کے مفتی عام شیخ عبدالعزیز ابن باز سے لوگ محروم ہوگئے اور ایسا لگا کہ ان کی متاع عزیز ان سے چھین لی گئی ہے۔ یہ لوگ جہاں بھی رہے زبان وادب، علم وعرفان کی شمعیں ان کی بدولت روشن تھیں لیکن ایک طرف ان کے جانے سے ہمیں دکھ اور ملال ہے تو دوسری طرف تھوڑا سا اطمینان وانشراح بھی ہے کہ حکومت سعودیہ عربیہ نے ان کی خاطر وخدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اور ان کو ہر طرح سے نوازا، چنانچہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کو اپنے ملک کے اعلیٰ انعام جو جائزۃ الملک الفیصل کے نام سے معروف ہے، ۱۴۰۴ھ میں نوازا اور علم نوازی کا حق ادا کردیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ملک کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے اور ان کو علماء اور محققین کی خدمت کرنے کا اور موقع عنایت کرتا رہے۔

مصادر ومراجع

(۱) احکام الاقاب شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۲) الحدیث النبوی شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۳) الاستصلاح والمصالح المرسلة فی الفقه الاسلامی شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۴) المغل الضاف والھمان فیه شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۵) نظام التامین والرای الشرعی فیه شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۶) الفقه الاسلامی ومدارسه شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۷) المدخل الفقھی العام الجزء الاول والثانی شیخ مصطفیٰ زرقاء۔ (۸) مجموعه فتاوی شیخ مصطفیٰ زرقاء۔(۹) الجرائد والمجلات۔

ایک گم شدہ علمی میراث
مدرسۂ نظامیہ بغداد

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

خواجہ نظام الملک طوسی کی نسبت مشہور ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اسلامی دنیا میں سب سے اول مدرسہ قائم کیا۔ ابن خلکان لکھتا ہے: **ھو اول من انشأ المدارس فاقتدیٰ به الناس** (۱) (یعنی وہ پہلا شخص ہے جس نے مدارس قائم کیے پھر لوگوں نے اس کی تقلید کی)۔

سبکی نے طبقات الشافعیہ میں خواجہ نظام الملک کے حالات میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ نیشاپور میں پرانے مدرسوں کے ہوتے ہوئے بھی نظام الملک کو موسس کیوں مانا جاتا ہے؟ اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام الملک پہلا شخص ہے جس نے مدارس کو ترتیب خاص کے ساتھ قائم کیا، نہ یہ کہ وہ اولین موسس مدارس اسلامی تھا۔ (۲)

نظام الملک سے قبل مدارس کا قیام خواہ علمائے اسلام کے ذریعہ سے ہوا ہو یا بادشاہوں، خلفاء اور ارکان سلطنت کی جانب سے، یہ سب ایک نجی اور قومی پہلو سے ہوا ہے نہ کہ سرکاری اور مملکتی سطح پر۔ پھر ان مدارس کی تعداد محدود رہی اور یہ مدارس ایک عالم یا ایک فقیہ کی تدریس اور طلبہ کی ایک محدود تعداد تک منحصر رہے۔ اگر اساتذہ اور طلبہ کے لیے تنخواہیں اور ماہانہ وظائف تھے بھی تو تقریباً نادر اور استثنائی تھے۔ یہ تنخواہیں اور وظائف بھی شخصی مال اور افراد کے ذاتی سرمایہ سے دیے جاتے تھے۔ مگر خواجہ نظام الملک وہ پہلا شخص تھا جس نے بادشاہ وقت کی رضامندی سے اپنے زیر اقتدار تمام اسلامی شہروں اور علاقوں میں مدرسے تعمیر کیے اور انہیں ایک نظم (بورڈ یا وفاق) کے ماتحت کیا۔ ملکی سطح پر اور مملکت کے خرچ پر سلسلۂ مدارس کا قیام اور انہیں ایک نظم کے تحت لانا ایک

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی۔

نئی بات تھی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔(۳)

اس کارخیر کی ابتدا کے بارے میں ''زبدۃ التواریخ'' کے مولف حافظ ابرو لکھتے ہیں:

''ایک دن سلطان الپ ارسلان نیشاپور گیا، فقہاء کی ایک جماعت مسجد کے دروازے پر تھی، سلطان نے دریافت کیا، یہ کون لوگ ہیں؟ نظام الملک نے کہا، یہ علماء ہیں اور یہ بہترین انسان ہیں اس لیے کہ انہوں نے فانی دنیا کی لذتوں کو چھوڑا ہے اور نفس کے فضائل و کمال پر متوجہ ہیں۔ سلطان کے دل میں ان کا احترام پیدا ہوا۔ نظام الملک نے عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو ہر شہر میں ایک ایسی جگہ تعمیر کی جائے کہ یہ حضرات وہاں تشریف رکھیں، ان کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جائے تاکہ یہ حضرات فراغت و آرام کے ساتھ خدمت علم میں مشغول رہیں اور سلطان کی مملکت کے دوام کی دعا کرتے رہیں۔ سلطان نے اجازت دے دی تو نظام الملک نے ملک کے تمام علاقوں میں مدارس کی بنیاد رکھنے کا حکم بھیجا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سال سلطان کے سرمایہ سے ستر مدرسے بنائے گئے اور نظام الملک وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ عمدہ طریقہ اختیار کیا۔(۴)

مدرسہ نظامیہ بغداد کے قیام کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک دن شیخ الشیوخ ابوسعد صوفی نیشاپوری خواجہ سے ملنے آئے اور کہا کہ آپ کے نام سے مدینۃ السلام (بغداد) میں ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں، جس کے ذریعہ آپ کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ خواجہ نے کہا، بہت خوب ضرور بنایئے۔ چنانچہ خواجہ نے فراہمی سامان کے لیے اپنے وکلاء کو اسی وقت حکم دے دیا اور شیخ نے دجلہ کے کنارے ایک خوبصورت قطعہ آراضی خرید کر مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا۔(۵)

عمادالدین الاصفہانی کے مطابق نظام الملک کو جس شہر میں کوئی عالم، فاضل نظر آجاتا وہاں فوراً ایک مدرسہ تعمیر ہو جاتا اور اس شخص کو درس و تدریس کا کام سپرد کر دیا جاتا۔ نظام الملک کی طرف سے وقف کی امداد کے علاوہ کتب خانہ بھی مہیا کیا جاتا۔(۶)

خواجہ نے نیشاپور، بغداد، بلخ، ہرات، اصفہان، بصرہ، مرو، آمل طبرستان، موصل اور عراق وخراسان کے ہر شہر میں مدرسہ تعمیر کرائے اور یہ سب مدارس نظامیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔(۷)

مدرسہ نظامیہ بغداد ان مدارس میں سب سے بڑا اور مشہور مدرسہ تھا جو خواجہ طوسی کے حکم سے پانچویں صدی ہجری کے نصف دوم کے اوائل میں عباسی دارالخلافہ مدینۃ السلام بغداد میں

تعمیر ہوا۔ بغداد اس زمانے میں دنیائے اسلام کا اہم ترین سیاسی، علمی و ادبی مرکز تھا۔ مدرسہ وسیع انتظامات کے ساتھ قائم ہوا۔ خواجہ نے اہل علم اساتذہ کا انتخاب کیا، مدرسین اور طلبا کے لیے تنخواہیں اور وظائف مقرر کیے اور ایسے نئے پروگرام بنائے کہ مدرسہ نظامیہ عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں مذاہب اہل سنت کا سب سے بڑا مذہبی اور تبلیغی مرکز بن جائے نیز وہ اسماعیلیوں کی تبلیغ اور پروپیگنڈہ کا مقابلہ کر سکے جو فاطمی خلفاء کے مرکز میں واقع جامع الازہر قاہرہ (۸) کی طرف سے عباسی خلافت اور مذاہب اہل سنت کے خلاف جاری تھا۔ اس مقصد کی خاطر اس نے اپنے سیاسی اثر ورسوخ اور تمام مادی امکانات اس مدرسہ کو عظیم تر بنانے میں لگا دیا ہے۔ جس کی بدولت نظامیہ بغداد بہت ہی جلد ایک بڑے اسلامی دارالعلوم کی صورت میں ظاہر ہوا اور دور دراز کے مسلمان علاقوں کے طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ مدرسہ تین صدیوں تک عملاً قائم رہ کر عالم اسلام کے ارباب دانش کا مرکز بنا رہا۔

آغاز تعمیر: نظامیہ بغداد کی تعمیر کا آغاز بروز سہ شنبہ یکم ذی القعدہ ۴۵۷ھ مطابق ۱۴/ اکتوبر ۱۰۶۵ء کو شہر بغداد کے مشرقی حصے میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک وسیع وعریض قطعہ زمین پر ہوا۔ تعمیر کے نگران شیخ الشیوخ ابوسعد احمد بن محمد صوفی نیشاپوری تھے (۹)۔ دو سال تک تعمیر کا کام جاری رہا اور یکم ذی القعدہ ۴۵۹ھ مطابق ۱۳/ ستمبر ۱۰۶۷ء کو عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی (۱۰)۔ عمارت کے صدر دروازے پر نظام الملک کا نام نقش کیا گیا۔ مدرسہ کے چاروں طرف بازار بنائے گئے اور حمام تعمیر کرائے گئے، جس سے ایک طرف تو عمارت کے حسن میں اضافہ ہوا اور دوسری طرف مدرسہ کے لیے آمدنی کا بھی بندوبست ہوگیا۔ مدرسہ کی تعمیری لاگت ساٹھ ہزار دینار تھی۔ خواجہ نے اس صرفہ کو منظور کیا اور رقم شیخ ابوسعد کو ادا کر دی گئی۔ (۱۱)

محل وقوع: مدرسہ بغداد کے مشرقی حصہ میں دجلہ کے ساحل پر واقع تھا اور ”سوق الثلاثا“ کے نام سے مشہور بازار کے وسط میں باب الازج کے نزدیک اور بغداد کی معروف عمارات میں سے ایک مدرسہ فرجان سے متصل تھا۔ اس کے اردگرد مدرسہ کے لیے وقف بازار تعمیر کیے گئے (۱۲)۔ محل وقوع کے لحاظ سے اس سے بہتر دوسری جگہ نہ تھی۔ شاہی محلات اور بازار سب نظامیہ سے ملحق تھے۔ خود خواجہ نے ایک بڑا بازار بنوایا تھا جس کی وجہ سے نظامیہ کی شان و

شوکت بہت بڑھ گئی تھی ۔(۱۳)

تعمیری خصوصیات اور وسعت: نظامیہ بغداد اپنی خوبصورتی اور عمارتی ترتیب کے لحاظ سے بھی اپنی نوعیت کا ایک منفرد اور بے مثال مدرسہ تھا (۱۴)۔ عماد الدین الاصفہانی کے مطابق نظامیہ میں کئی اقامت گاہیں تھیں جن میں معلمین اور متعلمین رہتے تھے (۱۵)۔ مدارس نظامیہ کی عمارت زیادہ تر چار گوشہ کے طور پر ہوتی تھی ۔ جس میں چار ایوان طولاً و عرضاً محوروں میں ہوتے تھے ۔ رہایشی کمرے، انتظامی دفاتر اور کتاب خانے عمارت کے کونوں میں بنائے جاتے تھے ۔ مدارس نظامیہ قدیم ترین چہار ایوانی مدارس ہیں ۔ بعد میں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں شام، مصر اور عالم اسلام کے مغربی علاقوں میں چہار ایوانی مدارس تعمیر کیے گئے ۔(۱۶)

اس عالی شان اور پرشکوہ عمارت نے بغداد آنے والوں اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا ۔ چنانچہ ابن جبیر اندلسی نے ۵۸۰ھ میں اس مدرسہ کو دیکھا اور لکھا ''بغداد کے تیس مدرسوں میں نظامیہ بغداد سب سے بڑا اور مشہور مدرسہ ہے (۱۷)۔ مدرسہ کی بناوٹ اور خوبصورتی اتنی اعلیٰ اور خیرہ کن تھی کہ عظیم الشان مدرسہ مستنصریہ کی تاسیس (۶۳۱ھ) کے بعد اور ۶۵۶ھ میں سقوط بغداد کے بعد بھی ۷۲۸ھ تک جب ابن بطوطہ نے اسے دیکھا تو اس کی نظر میں یہ مدرسہ بے مثال تھا (۱۸)۔ نظامیہ بغداد میں ایک وسیع صحن تھا ۔ فقہاء اور مدرسین کے قیام کے لیے بڑے بڑے کمرے تھے، مسجد تھی، مؤذن اور دربان کا خصوصی کمرہ تھا ۔ لائبریری تھی ۔ ایندھن، روشنی اور دیگر ضروری ساز و سامان کے لیے گودام تھے ۔ مدرسہ کی تعمیر کی وجہ سے مشرقی بغداد کے علاقے کی بڑی رہایشی آراضی اور دجلہ کے کنارے واقع محلے جو ''**مشرعة الزوايا**'' ''**باب الشعير**'' اور ''**درب الزعفراني**'' کے نام سے مشہور تھے، کام میں آ گئے ۔(۱۹)

مدرسہ کا وسیع و عریض صحن اردشیر عبادی مروزی (واعظ نظامیہ) کی پرجوش مجلس وعظ کے دوران حاضرین سے بھر جاتا تھا ۔ اردشیر عبادی نے شوال ۴۸۶ھ میں نظامیہ بغداد میں وعظ شروع کیا ۔ امام غزالی نے اس مجلس وعظ میں شرکت فرمائی تو مدرسہ کا صحن، اس کے برآمدے، کمرے اور ارد گرد کے گھر سامعین سے بھر جاتے تھے، جن کا اندازہ تیس ہزار تک لگایا گیا ۔(۲۰)

سالانہ مصارف: خواجہ نظام الملک نے سالانہ چھ لاکھ دینار مدارس کی عمارت کی تعمیرات

پر اور اہل علم کی امداد کے لیے مختص کیے تھے (۲۱)۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے ''نظام الملک نے ۲/لاکھ دیناراس کی تعمیر پر صرف کیے اور ہر سال پچاس ہزار دینار طالب علموں کے نفقہ پر صرف کرتا تھا۔ یہاں چھ ہزار طالب علم، علوم فقہ، تفسیر، حدیث اور ادب کی تحصیل میں مشغول تھے۔ نظام الملک مدرسہ کے جملہ مصارف برداشت کرتا تھا۔ وقف نامہ کی رو سے خازن دار الکتب کو ہر ماہ دس دینار ملتے تھے''۔(۲۲)

اوقاف: نظامیہ کے مصارف کے لیے سرکاری امداد یا ارباب خیر کی فیاضیوں اور چندوں پر ہی انحصار نہیں کیا گیا تھا بلکہ متعدد بازار، حمام اور زرعی جاگیریں اس کے لیے وقف تھیں۔ اس مقصد کے لیے خواجہ نظام الملک نے ابوسعد صوفی کو حکم دیا کہ مدرسہ کے اردگرد کے بازار مدرسہ کے لیے وقف کردے (۲۳)۔ چنانچہ اس نے حمام، املاک، دکانیں اور سرائیں خریدیں اور ان سب کو نظامیہ کے لیے وقف کردیا، تاکہ ایک مستقل آمدنی جاری ہوجائے۔

اس کے علاوہ خواجہ نظام الملک کی ذاتی املاک کی آمدنی سے دس فیصد اور آل سلاجقہ کے خزانے سے دو لاکھ دینار سالانہ کی رقم جو تعلیمی اخراجات کے لیے وقف تھی، اس سے بھی نظامیہ کو حصہ رسدی ملتا تھا (۲۴)۔ زکوٰۃ و خیرات کی مد اس کے علاوہ تھی (۲۵)۔ رؤسا و امراء بھی اپنی جائدادیں نظامیہ کے لیے وقف کرتے تھے۔ خود ابوسعد صوفی نے انتقال کے وقت (۴۷۹ھ) تمام جائداد وقف کردی تھی۔(۲۶)

اوقاف اور مدرسہ کے اموال کی کیفیت رجسٹروں میں ریکارڈ رکھی جاتی تھی۔ اس کے لیے شرائط اور قواعد وضوابط باضابطہ تحریر کیے گئے اور مدرسہ کے متولیوں اور ذمہ داروں کو ان کا پابند بنایا گیا۔ مدرسہ کے وقف نامہ کا ایک حصہ جسے جوزی نے محفوظ کیا ہے۔ یوں ہے:

وفی کتاب شرطها انها وقف علی	وقف کرنے والے نے وقف نامہ میں یہ
اصحاب الشافعی اصلا و فرعا و	شرط عائد کی تھی کہ مدرسہ نظامیہ اور اس کے
کذلک الاملاک الموقوفة علیها	اوقاف اصول وفروع میں مذہب شافعی
شرط فیها ان یکون علی اصحاب	کے پیروکاروں کے لیے وقف ہوں۔ نیز
الشافعی اصلا و فرعا و کذلک	مدرس، واعظ، لائبریرین، قاری اور صرف و

شرط فی المدرس الذی بها	نحو کے مدرس، تمام حضرات اصول وفروع
والواعظ الذی یعظ بها و متولی	میں شافعی المذہب ہوں۔ان میں سے ہر
الکتب و شرط ان یکون فیها	ایک کے لیے اوقاف میں حصہ مقرر تھا۔
مقرئ یقرئ القرآن و نحوی	سالانہ عطیات وانعامات میں سے ۲۰۰ کر
یدرس العربیة وفرض لکل قسطا	(ایک پیمانہ) اور پھر اٹھارہ ہزار دینار نظامیہ
من الوقف وکان یطلق ببغداد کل	کے اخراجات کی خاطر بغداد بھیجے جاتے
سنة من الصلات مأتی کر و ثمانیة	تھے۔
عشر الف دینار ۔(۲۷)	

اس وقف نامے کو امیر عمید ابونصر نے جو ان اوقاف کا منتظم یا اس وقف نامہ کا مرتب تھا، بروز دوشنبہ ۲۶/ جمادی الآخر ۴۶۲ھ میں عمائد شہر کے سامنے پڑھا۔ابوالقاسم بن فخر الدولہ وزیر اور شافعی وحنفی مذاہب کے علماء، قاضی القضاۃ اور چند معززین کو وقف نامہ سننے کے لیے نظامیہ میں بلایا گیا۔اس میں وقف کردہ کتابوں، جاگیروں، املاک اور نظامیہ کے اردگرد کے بازاروں کی کیفیت کے بھی حوالے تھے اور وہ شرائط بھی تھے جن کی نظام الملک کی اولاد کو پابندی کرنا تھی۔(۲۸)

ابوشامہ نے کتاب ''الروضتین'' میں لکھا ہے کہ نظام الملک نے جب اپنے نام پر مشہور ادارے تعمیر کیے تو ان کے اخراجات کے لیے اس نے کافی املاک وقف کیں۔(۲۹)

درج بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ مدرسہ کے اخراجات، مختلف ادوار میں اوقاف کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ابن جبیر لکھتا ہے ''مدرسین کے لیے جاگیریں اور اوقاف مقرر ہیں۔ان کا کل اہتمام مدرسین کے سپرد ہے۔جو طلبا مدارس میں رہتے ہیں، انھیں معقول وظیفے ملتے ہیں''۔(۳۰)

نظام الملک نے جب امام الحرمین جوینی کے لیے مدرسہ نظامیہ نیشاپور تعمیر کیا تو خطابت، تدریس، مدرسہ کے اوقاف کے معاملات کی نگرانی اور ان سے وابستہ کام، ان کو تفویض کردیے۔(۳۱)

آمدنی کی یہ رقوم ہمیشہ یکساں نہیں رہتی تھیں اور سیاسی حالات بھی ان پر براہ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ چنانچہ کبھی مدرسہ کے اوقاف اور آمدنی مفاد پرست افراد کے غاصبانہ تجاوز کا نشانہ بھی بن جاتی تھی۔ ۵۱۷ھ کے واقعات میں جوزی کا بیان ہے:

''اسعد میہنی اس سال شعبان کے آخر میں مدرسہ کی سرپرستی اور اوقاف کے انتظام و انصرام کے لیے ابن الباقرحی کا جانشین مقرر ہوا۔ بغداد آنے کے بعد اس نے وزیر احمد علی سے اس بات پر اتفاق کیا کہ فقہاء کی ایک تعداد کے حقوق و تنخواہیں بند کردی جائیں۔ جس کے نتیجے میں تدریس کے معاملے میں خلل پیدا ہوگیا اور فقہاء نے مجالس درس میں شرکت سے اجتناب کیا''۔(۳۲)

۶۵۶ھ میں ہلاکو خان کے ہاتھوں سقوط بغداد کے نتیجے میں نظامیہ کے اوقاف کی آمدنی اور مدرسین اور خادموں کے حقوق اور تنخواہوں میں خلل واقع ہوا، جو ۶۷۲ھ تک جاری رہا۔ اس سال خواجہ نصیر الدین طوسی نے حکم دیا کہ اوقاف کو بحال کیا جائے اور تنخواہیں پہلے کی طرح ادا کی جائیں(۳۳)۔ مدرسہ کا بازار جو ۶۷۰ھ کی آتش زدگی میں مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا عطا ملک جوینی کے حکم اور اوقاف کی آمدنی سے از سر نو تعمیر ہوا۔(۳۴)

بہت سے علماء تعلیم کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے اور اس اصول پر سختی سے قائم تھے۔ چنانچہ جب نظام الملک نے ان کے مصارف کے لیے جائدادیں وقف کیں تو علماء و فضلاء کے ایک اجتماع میں اس کی مذمت کی گئی کہ لوگ اب علم کی خاطر علم حاصل نہیں کریں گے۔(۳۵)

لیکن بلکہ صدیوں تک ان تعلیمی اداروں کے دوام و استمرار کا ایک سبب یہی اوقاف تھے اور یہی وہ مالی پشت پناہی تھی جس نے ان اداروں کی زندگی کو دوام بخشا۔

رسم افتتاح: بروز شنبہ ۱۰/ذی القعدہ ۴۵۹ھ مطابق ۲۳/ستمبر ۱۰۶۷ء نظامیہ بغداد کی رسم افتتاح انجام پائی۔ اس موقع پر پورا شہر نئی عمارت میں اُمنڈ آیا۔ تقریب کا آغاز شیخ ابواسحاق شیرازی کو کرنا تھا جو اپنے عہد کے شیخ الشیوخ اور استاذ کل تھے۔ مگر وہ بعض شکوک کی بناء پر اس میں شریک نہ ہوئے(۳۶)، تو شیخ عبدالملک ابومنصور بن یوسف نے جو اعیان بغداد میں نہایت عالی منزلت تھے، حاضرین جلسہ سے خطاب کیا اور ابونصر بن صباغ سے درس کی درخواست کی۔ چنانچہ شیخ ابونصر بن

صباغ نے مسند درس کو رونق بخشی اور یوں نظامیہ میں تدریس کا آغاز ہوا۔(۳۷)

نظامیہ کا انتظامی اور تعلیمی عملہ: نظامیہ کی انتظامیہ کا معیار بھی بلند تر تھا۔ باقاعدہ مستشرق لیوی نے ''اے بغداد کرانیکل'' میں فراخ دلی سے لکھا کہ اس نظام کو بعد میں یورپ کی جامعات نے اختیار کیا اور ان کی انتظامی ہیئت اسی کی نقل ہے۔(۳۸)

عبدالرزاق کانپوری کے مطابق مدرسہ نظامیہ بغداد کے عام انتظامات اور نگرانی کاروبار کے لیے اسی قدر عملہ کی ضرورت تھی جس قدر ایک چھوٹی سی ریاست کے لیے ہوا کرتی ہے(۳۹)۔ ادنیٰ درجہ کے کس قدر ملازم تھے ان کا احاطہ مشکل ہے لیکن وہ عہدے دار جو نظامیہ بغداد کے مختلف شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے تھے اور مدرسہ کے اوقاف کی آمدنی سے تنخواہیں پاتے تھے ان کی ایک جھلک اس طرح ہے۔

متولی: نظامیہ کے عہدہ داروں میں سب سے بڑا عہدہ دار متولی کہلاتا تھا۔ جیسے جدید جامعات میں شیخ الجامعہ۔ دفتری نظام کا سربراہ بھی یہی تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نظامیہ کی حدود میں قیام کرے۔ دفتری اور انتظامی امور کی انجام دہی اسی سے وابستہ تھی۔ یہ خدمت مستقل تھی مگر بعض اوقات مدرس اعظم کے بھی سپرد ہو جایا کرتی تھی جو تمام شیوخ میں صدر اعظم کا درجہ رکھتا تھا۔(۴۰)

جن علماء نے نظامیہ بغداد میں متولی کے فرائض انجام دیے۔ ان میں ابوسعد عبدالرحمٰن بن محمد المامون المعری (م ۴۷۸ھ)، ابوالفتح بن باقرحی (م ۵۳۳ھ)، یوسف بن عبداللہ دمشقی (م ۵۶۳ھ) جیسے افاضل بھی شامل ہیں۔(۴۱)

ناظر: دوسرا بڑا عہدہ ناظر کا تھا۔ جو نظامیہ سے متعلق جائدادوں اور اوقاف کا نگران تھا۔ گویا ناظر، افسر مالیات تھا۔ اس اہم عہدہ پر نہایت لائق اعتماد افراد کا تقرر ہوتا تھا۔ ناظر وقف سے متعلق تمام اختیارات کا حامل ہوتا تھا(۴۲)۔ غالباً اسی لیے عہدہ نظام الملک اور اس کی اولاد کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے پرپوتے خواجہ ابونصر (م ۵۶۱ھ) کا نام بھی بطور ناظر کے آتا ہے۔(۴۳)

ان کے علاوہ مدرسہ کے بعض مدرسین بھی اس عہدہ پر فائز ہوئے، جن میں ابوعلی یحییٰ بن الربیع (م ۶۰۶ھ)، عبدالقادر بن داؤد (۶۱۹ھ)، رضی الدین ابوداؤد سلیمان (م ۶۳۱ھ)

اور محمد بن یحییٰ بن فضلان (۶۳۱ھ) وغیرہ شامل ہیں۔(۴۴)

مفتی: غیر تدریسی عملے میں مفتی کو اہمیت حاصل تھی۔فتویٰ نویسی کے لیے نظامیہ میں جداگانہ عملہ تھا۔بعض صورتوں میں شیخ الفقہ اور شیخ الفرائض کو فتویٰ نویسی کی خدمت سپرد کی جاتی تھی۔(۴۵)

رضی الدین ابوداؤد سلیمان (م۶۳۱ھ) اور صائن الدین ابومحمد عبدالعزیز الجبلی (م۶۳۲ھ) نے بھی مفتیٔ نظامیہ کے فرائض انجام دیے۔(۴۶)

واعظ: ایک غیر تدریسی عہدہ واعظ کا تھا۔اس حیثیت سے شیوخ نظامیہ وعظ دیتے اور کبھی باہر سے آنے والے علماء یہ خدمت انجام دیتے۔ان مواعظ میں طلبہ واساتذہ کے علاوہ امراء، علماء وعوام بھی شریک ہوتے تھے۔یہ بالکل آزاد طریقہ تعلیم تھا۔قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اقوام قدیمہ جیسے موضوعات پر یہ مواعظ مشتمل ہوتے۔(۴۷)

محمد بن احمد بن عثمان دیباجی (۵۲۷ھ)، احمد بن محمد بن ثاقب خجندی (م۵۳۱ھ)، یوسف بن ایوب ہمذانی (م۵۳۵ھ)، ابوبکر صدر الدین خجندی (م۵۵۲ھ) اور یوسف بن عبد اللہ دمشقی (م۵۶۳ھ) کا نام مشہور واعظین میں لیا گیا۔(۴۸)

خازن: کتب خانہ کے مہتمم کو خازن کہا جاتا تھا۔مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ کو کتابیں فراہم کرنے کے علاوہ ان کے فرائض میں کتابوں کی خریداری اور انہیں نقل کروانا بھی تھا۔خازن کا انتخاب بلند پایہ علماء وادباء میں سے کیا جاتا۔مثلاً قاضی ابویوسف الاسفرائنی (م۴۹۸ھ) اور ان کے انتقال کے بعد مشہور عالم اور ادیب محمد بن احمد الابیوردی (م۵۰۸ھ) مدرسہ نظامیہ کے مہتمم کتب خانہ بنے (۴۹)۔ان کے علاوہ ابوزکریا یحییٰ بن علی التبریزی (م۵۰۲ھ) (۵۰) اور نامور مصنف اور خوش نویس علی بن احمد بن باقری (م۵۷۵ھ) بھی نظامیہ میں خازن کے عہدہ پر فائز ہوئے۔(۵۱)

خادم: مدرسہ نظامیہ کے اساتذہ کو خادمون کی سہولت بھی حاصل تھی۔مدرس نظامیہ بغداد، شیخ ابواسحاق شیرازی کے خادم کا نام ابوطاہر بن شعبان تھا۔اسی طرح نظامیہ کے دیگر اساتذہ کے بھی خادم تھے۔(۵۲)

دربان: دربان بھی تھے ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ حدود مدرسہ میں ہر آنے والے کی اطلاع

مدرسہ کے ذمہ داروں کو دیں اور مدرسہ میں بھی حالات پر نظر رکھیں ۔ ادب کے مدرس اور لائبریرین ابوزکریا خطیب تبریزی نے جب کچھ نامناسب کاموں کا ارتکاب کیا تو ایک دربان نے یہ بات خواجہ کو لکھ بھیجی (۵۳) ۔ ابن جوزی نے ۵۴۷ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اس سال نظامیہ کے ایک طالب علم یعقوب خطاط نے وفات پائی ۔ ترکہ کے ذمہ داروں نے نظامیہ میں اس کا حجرہ بند کر دیا اور اسے سر بہ مہر کر دیا۔ طلبہ نے شورش کی تو دربانوں نے ان دو کو پکڑ لیا اور جیل میں ڈال دیا۔ (۵۴)

نظامیہ کا تدریسی عملہ: تدریسی عملہ میں جو ترتیب قائم کی گئی تھی وہ آج کل کی جامعات سے کچھ مختلف نہ تھی ۔ تدریسی عملہ میں جید علماء وفضلاء شامل ہوتے ۔ ان کی تقرری اس وقت تک مکمل نہ ہوتی تھی جب تک خلیفہ اس کی منظوری نہ دیتا۔

مدرس: تدریسی عملہ میں سب سے اعلیٰ مقام مدرس یا شیخ کو حاصل تھا ۔ ہر فن یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، صرف، نحو، ادب، علم الکلام وغیرہ کے مدرس جداگانہ تھے ۔ ہر مدرس تھے ۔ (۵۵)

نائب مدرس: دوسرا اہم عہدہ نائب مدرس کا تھا ۔ نائب مدرس کا کام مدرس کی غیر موجودگی میں تدریس کے فرائض انجام دینا تھا ۔ جب امام محمد غزالی بغداد سے دمشق چلے گئے تو ان کے بھائی احمد الغزالی نے بطور نائب مدرس، فرائض انجام دیے (۵۶) ۔ یوسف دمشقی (۵۶۳ھ) کی موت کے بعد ابوجعفر بن احمد بن صباغ (م ۵۸۵ھ) نے نائب مدرس کے فرائض انجام دیے ۔ (۵۷)

معید: تیسرا تدریسی عہدہ معید کا تھا ۔ جسے ہم معاون استاد کہہ سکتے ہیں ۔ قلقشندی نے معید کے فرائض میں لکھا ہے:

اذا القی المدرس الدرس	مدرس اپنا درس دینے کے بعد چلا جاتا تو
وانصرف ، اعاد للطلبة ما	معید استاد کی گفتار طلبہ کے لیے از سر نو بیان
القاه المدرس لیفھموہ و	کرتا تا کہ وہ اسے سمجھ جائیں اور سبق ان کو
یحسنوہ ۔ (۵۸)	خوب ذہن نشین ہو جائے ۔

ہر شیخ یا نائب شیخ کے ساتھ ایسے دو یا دو سے زائد معید ہوتے تھے (۵۹) ۔ مدرسین اور

طالب علموں کے درمیان معید کا منصب ایک کڑی کا تھا۔ وہ طلبہ کے ساتھ اسباق کی سماعت کرتا اور درس ختم ہونے کے بعد اس کا اعادہ کا عمل شروع ہوجاتا۔ کبھی کبھی ایک ہی شخص ایک مدرسے میں مدرس اور دوسرے میں معید کے فرائض انجام دیتا تھا۔ (۶۰)

کبھی یہ خدمت ذہین اور قابل طلبہ کو سپرد کی جاتی ۔ جن کا انتخاب حلقہ درس سے ہوتا تھا۔ بعض اوقات دوسرے علماء بھی یہ خدمت انجام دیتے ۔ جیسے سدید بن محمد بن ھبۃ اللہ بن عبداللہ السلماسی (م ۵۰۷ھ)، اپنے زمانے کے مشہور اہل علم تھے اور معید کے فرائض بھی انجام دیتے تھے (۶۱)۔ ان کے علاوہ ابن شداد (م ۶۳۲ھ) کا نام بھی نامور معید کی حیثیت سے آتا ہے۔ (۶۲)

محققین: دنیا کے دور دراز حصوں سے علماء آتے اور مدرسہ کے مہمان رہ کر علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ۔ (۶۳)

جیسے ابوزکریا یحییٰ بن علی التبریزی (م ۵۰۲)، مجدالدین یحییٰ ابن الربیع (م ۶۰۶ھ)، ابوالعباس بن عون (۶۴) اور مشہور شاعر ابواسحاق ابراہیم بن یحییٰ کلبی غزی (م ۵۲۴ھ) وغیرہ۔ (۶۵)

مدرس کے تقرر کے شرائط: منصب تدریس کے لیے نظامیہ کے ضابطے بھی ایسے تھے جن کا پہلے رواج نہ تھا۔ مدرسین کے علمی، اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں سے متعلق ۔ یہ قواعد وضوابط خود نظام الملک کی طرف سے بڑی باریک بینی اور نگرانی کے ساتھ زیر عمل لائے گئے ، بعد میں بھی یہی اصول رائج رہے ۔ (۶۶)

مدارس نظامیہ کی ابتدا ایک استاد کی تدریس کے اصول پر ہوئی (۶۷) بعد میں دو اور پھر اس سے زیادہ اساتذہ کی تقرری ہونے لگی۔

مدرس کا معیار کس درجہ بلند مطلوب تھا اس کا اندازہ ابواسحٰق شیرازی سے ہوتا ہے جو سب سے پہلے بطور مدرس منتخب ہوئے ، وہ علمائے شافعیہ میں سب سے نمایاں ، ہم عصر علماء کے سرخیل تھے اور طالب علموں کے لیے سب سے پرکشش مرجع تھے ۔ بعض کا یہ عالم تھا کہ ان ہی کے الفاظ میں ''میں عراق سے لے کر خراسان تک جس بھی شہر یا گاؤں سے گزراہوں وہاں کے امام، مدرس یا قاضی کو اپنا شاگرد یا اپنے ساتھیوں میں سے ایک پایا ہے''۔ (۶۸)

امام محمد غزالی ۴۸۴ھ میں تدریس پر مامور ہوئے، ان کی جلالت شان محتاج بیان نہیں۔ اصحاب شافعیہ میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا (۶۹)۔ اسی طرح ابوبکر الشاشی ۵۰۴ھ میں مدرس ہوئے۔ وہ وقت کے جلیل القدر فقیہ اور ائمہ شوافع میں سے تھے۔ (۷۰)

علمی کمالات کے ساتھ نظامیہ کے مدرسین اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے بھی بڑی اعلیٰ سطح رکھتے تھے۔ صالحیت وفضیلت کی وجہ سے عوام الناس اور ارباب حکومت دونوں کے یہاں قابل اعتماد واحترام ہوتے تھے۔ یہ اعتماد اس درجے کا ہوتا تھا کہ خلیفہ کے انتخاب میں بھی ان کی رائے لی جاتی (۷۱) اور کبھی مختلف خطوں کے حکمرانوں کے لیے وہ خلیفہ کے سفیر اور امور مملکت میں مشیر بھی ہوتے تھے (۷۲)۔ ان صاحب تدریس علماء کا معیار اتنا بلند تھا کہ اگر کسی مدرس میں ذرا بھی بدعملی کا شائبہ ملتا تو وہ عہدے سے معزول کردیا جاتا (۷۳)۔ نظام الملک کا پوتا ابونصر مدرس تھا، تمام تر احترام ورسوخ اور بانی مدرسہ کے ساتھ خاندانی شرف تعلق کے باوجود محض اس جرم میں مدرسی سے معزول کردیا گیا کہ ایک عورت نے شکایت کی کہ ابونصر نے اس سے شادی کی ہے، ابونصر نے پہلے تو اس بات سے انکار کیا مگر بعد میں اعتراف کرلیا۔ (۷۴)

نظامیہ بغداد کے قیام کی ایک غایت شافعی مذہب کی تقویت واشاعت بھی تھی۔ اس لیے مدرس کے لیے ضروری اور قابل لحاظ شرط یہ تھی کہ وہ شافعی مذہب کا معتقد اور مقلد ہو۔ اسی لیے بہت سے ایسے علماء جو تدریس کے لیے موزوں تھے وہ شافعی نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہے۔ یہ بھی ہوا کہ کسی مدرس کے بارے میں اگر یہ معلوم ہوا کہ وہ شافعی مسلک کا نہیں ہے تو اس کو سبک دوش کردیا گیا جیسا کہ ۴۹۵ھ میں الکیاالہراسی کے ساتھ ہوا۔ ان پر باطنی ہونے کی تہمت تھی (۷۵)۔ اسی طرح فصیحی استرآبادی (م ۵۱۶ھ) کو تشیع کے الزام میں تدریس سے محروم کردیا گیا۔ (۷۶)

اسی لیے بعض علماء نے شافعیت کا اعلان کرنا مناسب سمجھا، جیسے حنبلی عالم احمد بن علی بن برہان (م ۵۱۷ھ) نے شافعی مذہب اختیار کیا (۷۷)۔ اسی طرح ابن المظفر بن علی بن نعیم المعروف بابن الحسر السلامی (م ۶۳۹ھ) بھی پہلے حنبلی تھے پھر شافعی ہوگئے۔ (۷۸)

مسلک کا یہ معاملہ وقتی بھی ہوسکتا ہے تاہم مدرسین کی اعلی دینی، علمی اور اخلاقی خوبیوں

میں کوئی کلام نہیں۔ابن عبداللہ السلمی المرسی (م ۶۵۵) کے بارے میں مقری لکھتے ہیں:

''وہ علوم القرآن، فقہ، خلاف، اصول، نحو اور لغت میں فضلاء کے امام تھے۔زاہد، متورع، متدین، عابد، کریم النفس، احسن طریقے پر عمل کرنے والے اور اچھے اخلاق کے حامل تھے''۔(۷۹)

ایک اور مدرس ابوزکریا تکریتی (م ۶۱۶ھ) کے بارے میں یاقوت کا بیان ہے:

''وہ ایک فرد کامل، فاضل، فقیہ، قاری، مفسر، نحوی، لغوی، عروضی اور شاعر تھے''۔(۸۰)

مدرس فخر الاسلام محمد بن احمد شاشی (م ۵۰۷ھ) کی عاجزی وانکسار کا یہ عالم تھا کہ جب پہلے دن وہ مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے تو ان پر رقت طاری ہوگئی۔پیش رو اساتذہ کے علم و فضل اور اپنی کم علمی کے احساس سے وہ اشک ریز ہوئے، ان کی زبان پر آیا

خلت الديار فسدت غير مسود ومن الغناء تفردی بالسودد (۸۱)

(ملک بزرگوں سے خالی ہوگیا، تب میں سردار بن گیا، میرا سردار بننا دراصل ملک کی بدبختی ہے)

حقوق ومراعات: مالیات میں رقوم واوقاف کا بڑا حصہ مدرسین کے حقوق کی ادائیگی کے لیے خاص تھا یہی وجہ ہے کہ اس طبقہ کے لیے تنخواہیں اور کافی مراعات تھیں (۸۲)۔یوں درس و تدریس کی خدمت میں مصروف علماء کی معاشی حالت، نظامیہ بغداد کے بننے سے بہت بہتر ہوگئی۔ ایک فائدہ یہ ہوا کہ مدارس نظامیہ ہوں یا دیگر مدارس، مدرسین کی تنخواہوں کو سرکاری اور قومی حمایت و سرپرستی مل گئی (۸۳)۔اساتذہ کو رہائش اور طعام کی سہولتیں بھی حاصل تھیں۔

جب فصیحی استرآبادی کو تدریس سے برطرف کیا گیا تو وہ قیام وطعام کی مراعات سے بھی محروم ہوگئے۔(۸۴)

اساتذہ کے علاوہ طلبہ کو کھانے کپڑے اور رہائش کی بھی سہولتیں مہیا تھیں بلکہ سواری کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔(۸۵)

اجازت تدریس: مدارس نظامیہ نے پہلی بار تقرر مدرسین کے سلسلے میں شرائط وضوابط سے روشناس کیا۔اب مدرس کا تقرر وزیر یا خلیفہ یا سلطان یا واقف (وقف کنندہ) کی جانب سے ہوتا

تھا۔(۸۶)

مدرس کی تقرری کے لیے مدرسہ کی انتظامیہ اوراس کے ذمہ دار کا پروانہ تقرری حاصل کرنا ضروری ہوگیا۔نظامیہ بغداد میں تو بادشاہ یا خلیفہ کی منظوری ضروری تھی (۸۷)،یعنی تدریس کی ذمہ داری سرکاری حکم نامہ کے تابع تھی۔خلاف ورزی کی شکل میں سرکاری مداخلت بھی ہوتی تھی۔

(باقی)

حواشی و اسناد محولہ

(۱)ابوالعباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان،''**وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان**'' تحقیق: ڈاکٹر احسان عباس،قم:منشورات الرضی،۱۳۶۴ء،ج۲،ص۱۲۹۔(۲)جلال ہمائی،غزالی نامہ،اردوترجمہ:رئیس احمد جعفری،لاہور:شیخ غلام علی اینڈ سنز،طبع اول،ت ن،ص۶۷۔(۳)نوراللہ کسائی،ڈاکٹر،مدارس نظامیہ و تاثیرات علمی واجتماعی آن،تہران:چاپخانہ سپھر،چاپ دوم،۱۳۶۳ء،ص۷۶۔(۴)حافظ ابرو،شہاب الدین عبداللہ،''زبدۃ التواریخ''،نسخہ خطی،تہران:کتابخانہ ملی ملک،ش۴۱۴۳۔۴۱۶۶،ص۱۷۷۔(۵)عبدالرزاق کانپوری،''نظام الملک طوسی''،کراچی:نفیس اکیڈمی،طبع دوم،ص۱۹۶۰ء،ص۵۱۹۔(۶)احمد شلبی،ڈاکٹر،تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ،اردوترجمہ:محمد حسین خان زبیری،لاہور:ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان،۱۹۶۳ء،ص ۵۴۔بحوالہ:تاریخ آل سلجوق،ص۵۷۔(۷)تاج الدین ابی النصر عبدالوھاب ابن تقی الدین السبکی،''**طبقات الشافعیة الکبریٰ**'' مصر:مطبعہ حسینیہ،طبع اول،ت ن،ج۳،ص۱۳۷۔(۸)چوتھی صدی ہجری کے وسط میں فاطمی خلفاء نے مصر میں جامع ازہر کے نام سے ایک عظیم درسگاہ کی تاسیس کی۔اس درسگاہ کا اصل مقصد ترویج علوم دینی،اقامت شعائر مذہبی اور تائید مذہب شیعہ علویہ تھا۔(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:محمد عبداللہ عنان،**تاریخ الجامع الازھر**،القاہرۃ:مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر،الطبعۃ الثانیۃ،۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء)۔(۹)ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن اثیر،''**الکامل فی التاریخ**''، بیروت:دار الاحیاء التراث العربی،۱۹۹۶ء،ج۱۰،ص۵۵۔(۱۰)ابوالفرج عبدالرحمٰن جوزی،**المنتظم فی تاریخ الملکوک والامم**،حیدرآباد دکن: دائرۃ المعارف العثمانیۃ،الطبعۃ الاولیٰ،۱۳۵۹،ج۸،۲۳۸۔نیز:ابن خلکان،ج۲،ص۱۲۹۔(۱۱)عبدالرزاق کانپوری،ص۵۱۹۔(۱۲)علی ظریف اعظمی،**مختصر تاریخ بغداد**، بغداد:مطبعۃ الفرات،۱۹۲۶ء،ص۸۱۔(۱۳)عبدالرزاق کانپوری،ص۵۱۸۔(۱۴)علی ظریف اعظمی،ص۸۲۔ (۱۵)احمد شلبی،ص۱۷۶۔(۱۶)عبدالرحیم غنیمہ،**تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری**،اردوترجمہ:محمد ظہیرالدین بھٹی،لاہور:اسلامک پبلی کیشنز،طبع اول،۱۹۹۹ء،(مقدمہ از نوراللہ کسائی)،ص۵۳۔(۱۷)ابن

جبیر، رحلہ ابن جبیر ، بیروت: دار صادر، ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء، ص ۲۰۵۔ (۱۸) ابن بطوطہ، سفر نامہ ابن بطوطہ، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری، کراچی: نفیس اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱۷۔ (۱۹) جوزی، المنتظم، ج ۸، ص ۲۳۸۔ (۲۰) ایضاً، ج ۹، ص ۵۷۔ (۲۱) ابوبکر محمد بن ولید طرطوشی، سراج الملوک ، قاھرہ: مطبعۃ بولاق، ۱۲۸۹ء، ص ۱۲۸۔ (۲۲) ابن بطوطہ، ص ۵۶۔ (۲۳) ابن اثیر، ج ۸، ص ۱۴۴۔ (۲۴) مقالات شبلی، ک ۳، ص ۴۰۔ بحوالہ: آثار البلاد قزوینی (ذکر طوس)۔ (۲۵) خواجہ نظام الملک نہایت فیاضی سے نظامیہ پر اخراجات کیا کرتا تھا جس پر اس کے حاسدین تاج الملک وغیرہ نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور خواجہ کی شکایتیں ملک شاہ سے کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ نظامیہ کے مصارف معلوم ہونے پر ملک شاہ سے کہا گیا کہ اس قدر روپیہ میں ایسی فوج مرتب ہوسکتی ہے، جس سے قسطنطنیہ فتح ہوسکتا ہے۔ اور یہ زمانہ عیسائی سلاطین کا ہے جن کا مقابلہ سلطان کو کرنا پڑتا ہے۔ مگر خواجہ کا حال یہ ہے کہ فضول کاموں میں بیت المال کو خالی کیے دیتا ہے۔ جب سلطان سے یہ شکایت متعدد مرتبہ کی گئی تو اس نے ایک دن معمولی طریقہ سے خواجہ سے کہا کہ پیارے باپ! چھ لاکھ دینار کے صرفہ سے تو ایک لشکر جرار تیار ہوسکتا ہے۔ جن لوگوں پر آپ زرِ کثیر لٹا رہے ہیں ان سے کیا کام نکل سکتا ہے؟ خواجہ نے جواب میں کہا: جان پدر! میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں، اگر نیلام کیا جاؤں تو پانچ دینار سے زیادہ بولی نہ ہوگی۔ لیکن تم ایک نوجوان ترک ہو۔ تاہم مجھے امید نہیں ہے کہ تیس دینار سے زیادہ تمھاری بھی قیمت لگے۔ اس پر خدا نے تم کو بادشاہ بنایا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ تم لذاتِ دنیوی میں منہمک رہتے ہو۔ نیکیوں کے مقابلہ میں گناہوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے۔ ممالک فتح کرنے کے لیے تم جو فوج بھرتی کرنا چاہتے ہو، ان کی تلواریں دو گز کی ہوں گی اور ان کے تیر تین سو قدم سے زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں ان کی دعاؤں کے تیر فرش سے عرش تک جائیں گے۔ جو کام ان کی دعاؤں سے ہوگا وہ تمھاری فوجیں نہیں کرسکتی ہیں۔ ملک شاہ، خواجہ کا یہ جواب سن کر بہت رویا اور کہا کہ پیارے باپ! ایسی فوجیں جس قدر ممکن ہو تیار کرو۔ (دیکھیے: عبدالرزاق کانپوری، ص ۵۲۳۔۵۲۴)۔ (۲۶) ابن اثیر، جلد ۱۰، ص ۵۵۔ (۲۷) جوزی، المنتظم، ج ۹، ص ۶۶۔ (۲۸) ایضاً، ج ۸، ص ۲۵۶۔ (۲۹) احمد شلبی، ص ۱۶۹۔ (۳۰) ابن جبیر، ص ۲۰۵۔ (۳۱) ابن خلکان، ج ۱، ص ۳۶۱۔ (۳۲) جوزی، المنتظم، ج ۹، ص ۲۴۶۔ (۳۳) کمال الدین ابوالفضل ابن فوطی، الحوادث الجامعہ فی المایۃ السابعہ ، بغداد: مطبعۃ الفرات، ۱۳۵۱ھ، ص ۱۷۔ (۳۴) عباس عزاوی، تاریخ العراق بین احتلالین، بغداد، ۱۳۵۳ھ، ج ۱، ص ۲۵۷۔ (۳۵) حاجی خلیفہ، کشف الظنون ، حیدر آباد دکن: مطبعۃ المعارف العثمانیۃ، ت ن، ج ۱، ص ۱۵۔ (۳۶) شیخ ابواسحاق شیرازی کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ جس زمین پر نظامیہ کی تعمیر ہوئی ہے وہ غصب کردہ ہے۔ جب ان کی باقاعدہ تشفی کرادی گئی تو بیس روز بعد انھوں نے تدریس کا آغاز کیا۔ (دیکھیے: ابن خلکان، ج ۲، ص ۱۲۹)۔ (۳۷) المنتظم، ج ۸، ص ۲۳۸، ۲۴۶،

۲۴۷۔ نیز ابن اثیر، ج ۱۰، ص ۲۰، ۲۳۔ (۳۸) علی محسن صدیقی، مقالات تاریخی، کراچی: قرطاس، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۴۔ بحوالہ: اے بغداد کرانیکل، کیمبرج، ۱۹۲۹ء، ص ۱۹۳۔ (۳۹) عبدالرزاق کانپوری، ص ۵۲۱۔ (۴۰) ایضاً، ص ۵۲۲۔ (۴۱) ابن کثیر، ج ۱۲، ص ۱۲۴۔ المنتظم، ج ۹، ص ۲۴۶۔ اسنوی، ج ۱، ص ۲۶۳۔ (۴۲) جارج مقدیسی، The Rise of Colleges، ایڈنبرگ: یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۱ء، ص ۴۸۔ (۴۳) جلال ہمائی، ص ۱۵۳۔ (۴۴) ابن کثیر، ۱۳، ص ۵۳ نیز ص ۹۸۔ ابن خلکان، ۱، ص ۱۰۹۔ اسنوی، ج ۱، ص ۲۶۳۔ (۴۵) عبدالرزاق کانپوری، ص ۵۲۲۔ (۴۶) ابن خلکان، ۱، ص ۱۰۹۔ ابن کثیر، ج ۱۳، ص ۱۴۳۔ (۴۷) ابن جبیر، ص ۱۹۴۔۱۹۶۔ (۴۸) سبکی، ج ۶، ص ۸۸۔۸۹ نیز ۱۳۳۔ ابن کثیر، ج ۱۲، ص ۲۱۲۔ ابن خلکان، ج ۷، ص ۸۷۔ (۴۹) ایضاً، ص ۳۴۱۔۳۵۸۔ (۵۰) ابن خلکان، ج ۴، ص ۱۹۲۔ (۵۱) شہاب الدین ابوعبداللہ یاقوت حموی، "**معجم الادبا**"، مصر، ۱۹۲۳ء، ج ۱۵، ص ۱۰۴۔۱۰۵۔ (۵۲) دیکھیے: جارج مقدیسی، ص ۲۲۲۔ (۵۳) ذہبی، **تذکرۃ الحفاظ**، حیدرآباد دکن: مطبعۃ معارف العثمانیہ، ت ن، ص ۲۷۰۔ (۵۴) جوزی، المنتظم، ج ۱، ص ۱۴۶۔۴۷۔ (۵۵) عبدالرزاق کانپوری، ص ۵۲۲۔ (۵۶) ابن خلکان، ج ۱، ص ۹۷۔ (۵۷) سبکی، ج ۶، ص ۱۴۹۔ (۵۸) ابوالعباس احمد بن علی قلقشندی، **صبح الاعشی فی صناعۃ الانشاء**، قاہرہ: مطبعۃ الامیریہ، ۱۳۳۸ھ، ج ۵، ص ۴۶۳۔ (۵۹) ایڈورڈ۔ جی۔ براؤن، A Literary History of Arabs، کیمبرج، ۱۹۶۹ء، ص ۲۷۶۔ (۶۰) احمد شلبی، ص ۱۲۰۔ (۶۱) ابن خلکان، ج ۴، ص ۶۰۲۔ (۶۲) ایضاً، ج ۷، ص ۸۷۔ (۶۳) عبدالرزاق کانپوری، ص ۵۲۵۔ (۶۴) ابن خلکان، ج ۴، ص ۱۹۲۔ ابن خلکان، ج ۷، ص ۸۷۔ الجامع المختصر، ج ۹، ص ۲۹۷۔۲۹۸۔ اسنوی، ج ۱، ص ۴۔ (۶۵) عماد الدین ابی الفداء اسماعیل ابن عمر بن کثیر، "**البدایۃ والنہایۃ فی التاریخ**"، مصر: مطبعۃ السعادۃ، ت ن، ج ۱۲، ص ۲۱۹۔ (۶۶) نوراللہ کسائی، ص ۱۲۵۔ (۶۷) دیکھیے: ابن کثیر، ج ۱۲، ص ۱۳۶۔ (۶۸) سبکی، ج ۴، ص ۲۱۵۔ (۶۹) ابن خلکان، ج ۴، ص ۲۱۶۔ (۷۰) جوزی، المنتظم، ج ۹، ص ۱۶۶۔ (۷۱) ایضاً، ج ۱۰، ص ۲۴۴۔ (۷۲) جمال الدین عبدالرحیم الاسنوی، "**طبقات الشافعیۃ**"، بیروت: دارالکتب العلمیہ، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ج ۱، ص ۲۰۷۔ (۷۳) نوراللہ کسائی، ص ۱۲۶۔ (۷۴) جوزی، المنتظم، ج ۱، ص ۲۰۳۔ (۷۵) ابن کثیر، ج ۱۲، ص ۱۷۲۔ (۷۶) یاقوت، ج ۱۵، ص ۶۷۔ (۷۷) ابن کثیر، ج ۱۲، ص ۱۹۴۔ (۷۸) ایضاً، ج ۱۳، ص ۱۵۸۔ (۷۹) احمد بن محمد المقری التلمسانی، "**نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب**"، مصر: مطبعۃ السعادۃ، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۳۶۸ھ/۱۹۴۹ء، ج ۳، ص ۱۱۔ (۸۰) یاقوت، ج ۲۰، ص ۲۹۔ (۸۱) ابن خلکان، ج ۴، ص ۲۲۰۔ (۸۲) جوزی، المنتظم، ج ۹، ص ۶۶۔ (۸۳) نوراللہ کسائی، ص ۱۲۷۔۱۲۸۔ (۸۴) یاقوت، ج ۱۵، ص ۶۷۔ (۸۵) احمد شلبی، ص ۱۶۹۔ (۸۶) عبدالرحیم غنیمہ، ص ۳۸۱۔ (۸۷) جوزی، المنتظم، ج ۱۰، ص ۱۴۲۔

تصوف اور بھکتی میں انسانی قدروں کا تصور اور خسرو اور کبیر کے کلام میں مشترک اور متضاد رویے

ڈاکٹر اخلاق احمد آہن٭

یونیورسل ہیومن ویلوز یا آفاقی انسانی قدریں محبت، امن، راستی یا سچائی، عمل صالح اور عدم تشدد پر مشتمل بتائی جاتی ہیں، جو جدید تصور ہے لیکن ظاہر ہے دنیا کے مختلف مذاہب، تمدن اور ان کے تجربات کی روشنی میں اس تصور کی تشکیل ہوئی ہے، جو بذات خود صدیوں کے انسانی تجربے کی کشید ہے۔

اس سے قبل دنیا کے مختلف مذاہب اور روحانی تحریکات نے ان عناصر کی آبیاری و پاسداری کی اور اس تصور کو فروغ دیا۔ ہندوازم، بودھزم اور اسلام یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ انھیں کی بنیاد پر ایشیا میں تصوف اور بھکتی نے فروغ پایا۔ چنانچہ صوفیہ اور سنتوں کے یہاں مساوی طور پر انسان اور انسان دوستی کا پیغام ملتا ہے اور ان تمام انسانی قدروں کا ماحصل وہ ''عشق'' کو قرار دیتے ہیں۔ معروف فارسی صوفی شاعر اور امیر خسرو کے پیش رو مولانا رومی نے تصور عشق کی ہمہ گیری کی تعریف کرتے ہوئے اسے ''طبیب جملہ علتہا'' یعنی تمام امراض و مسائل کا حل قرار دیا ہے تو دوسری طرف ان حکمرانوں اور حاکموں کو تنبیہ کی ہے جو کشور کشائی میں اس قدر غرق ہیں کہ عام لوگوں کی پریشانیوں اور رنج و غم سے بے خبر ہو گئے ہیں:

اسپ ہمت سوی اختر ساختی — آدم مسجود را نشناختی

(آسمان کو سر کرنے کے لیے تم اپنے گھوڑے تو دوڑا دیے، لیکن تم ان انسانوں کو نہ پہچان سکے جو تمہاری توجہ کے طالب اور حقدار ہیں)

٭ شعبۂ فارسی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷۔

ایسی صورت میں صرف جذبۂ عشق ہی ہے جو سب کو دل سوزی اور محبت کا سبق سکھاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:

شاد باش ای عشق خوش سودای ما ای طبیب جملہ علتہای ما
از محبت تلخہا شیریں شود از محبت مسّہا زریں شود
از محبت نار نوری می شود وز محبت دیو حوری می شود
از محبت مردہ زندہ می شود وز محبت شاہ بندہ می شود

خسرو اسی مکتب کے پیرو ہیں اور عشق کی افضلیت اور عقل پر اس کی فوقیت کے قائل بلکہ انسان اور جمادات میں عشق وسوز کو ہی وجہ امتیاز گردانتے ہیں:

ہر دل بے عشق را من دل نہ گویم تن بے سوز را جز گل نہ گویم
شکایت نادرم از عشق بر عقل جفاے شحنہ ہر عامل نگویم
مگو با من کہ عاقل نیست عاشق کہ من بے عشق را عاقل نگویم

ہندوستانی تہذیب مختلف نظریات وعقاید اور فلسفوں کا مجموعہ اور خوبصورت سنگم ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ تصوف اور تصوف کی وہ روایت جو برصغیر میں پروان چڑھی، اس کی اساس بودھزم پر رکھی گئی ہے۔

بودھزم اور اسلام میں تاریخی اعتبار سے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں وسیع پیمانے پر عسکری جارحیت یا شکست کا شکار ہوئے اور اس سے اہم نکتہ یہ کہ ان مذاہب نے اپنی یا سیاسی ہمہ گیری اور سلطنت کو گنوایا اور وسیع پیمانے پر تشدد کا سامنا کیا لیکن اس کے باوجود فلسفیانہ طور پر اپنے گہرے اثرات بھی مرتب کیے۔ چینی سیاحوں کے بیانات جو انھوں نے سفید ہونوں اور ترکوں کے حملوں اور اس کے نتیجے میں ہندوستان اور خصوصی طور پر مرکزی ایشیا اور شمال مغربی خطے میں بودھزم کے سلسلے میں بتدریج زوال کے واضح اشارے کیے ہیں اور آخرالذکر کے بارے میں چنگیز خان اور بعد میں ہلاکو کے حملوں کی تاریخ سے سب واقف ہیں، ان دونوں حملہ آوروں نے جس پیمانے پر ایران اور بعد ازاں صدر خلافت عباسی میں خوں ریزی کی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ایران کی آدھی آبادی کا خاتمہ ہوگیا اور دوبارہ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں یہ

آبادی ہوئی۔فرانسیسی معاصر بادشاہ لوئی چہارم کو لکھے ایک خط میں ہلاکو نے خود ایران میں بیس لاکھ لوگوں کے قتل کرنے کا اعتراف کیا۔لیکن ظاہری فتوحات سے تہذیبی عناصر نہیں مرتے بلکہ وہ اپنا اثر دکھاتے ہیں، بقول اقبال (پیام مشرق):

برہمنے بہ غزنوی گفتہ کرامتم نگر تو کہ صنم شکستۂ بندہ شدی ایاز را

اسی طرح فاتح عربوں اور اسلام میں داخل ایرانی سیاسی و معاشرتی اقدار کو اس کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔شہنشاہیت اور اس کے بکھیڑوں سے لے کر روزمرہ زندگی میں ایرانی عادات وعقائد کا دخل اس کا ثبوت ہے۔(راولینس، سیونتھ مونارکی، باب بیست وہفتم بحوالہ ہندوستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں، کنور محمد اشرف، ترجمہ قمر الدین، ترقی اردو بیورو، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۹ء، ص ۵۱-۵۲) خود نظریہ وحدت الوجود دنیا کی کئی فلسفیانہ دھاراؤں کا مجموعہ ہے۔جہاں ایک طرف مغرب میں ابن عربی نے قدیم یونانی فلسفہ Gnotocism کا احیاء کیا تو دوسری طرف بودھزم کے علاوہ زرتشتی نظریہ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

زرتشت کے مذہب کا وجود اعلیٰ اہورامزدا اپنے نام میں ہی ثنوی ہے جو روح اور مادے کے خدا کا ہے۔روح خیر ہے اور مادہ شر، روح نور ہے مادہ ظلمت۔اہورامزدا کے پہلے تنزل یا پہلی کرن کا نام آشا ہے جو خدا کے ابدی قانون کی صداقت کا مظہر ہے۔اسے پالینا ابدی صداقت کے مظہر (اہورامزدا) کو پالینا ہے۔ایران کے فلسفۂ مذہب کی ابتداء اسی باطنیت سے ہوئی۔بعد کے مفکرین مانی اور مزدک نے اسی تصور کی نئی توضیح وتعبیر کی۔(وحید اختر، بھارت بانی، ص ۷۷)

اس تاریخی پس منظر میں صوفیہ کا اور خاص طور سے چشتیہ صوفیہ کے بادشاہوں سے اعراض کی وجہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس کے دو اہم اسباب ہیں۔اول تو یہ کہ صوفیہ عوام سے وابستہ ہیں اور وہ عشق با خدا وخلق خدا کے قائل ہیں۔بادشاہ سے وابستگی یا حمایت، عوام مخالفت یا خودغرضی کی طرف لے جا سکتی ہے، جو ان کے اس بنیادی اصول کے منافی ہے۔دوسرے یہ کہ بادشاہی نظام ''مجازی خدا'' اور ''ظل اللہ'' ہونے کا مدعی تھا اور لوگوں کو جھکنے، سجدہ کرنے اور کورنش بجالانے پر مجبور کرتا تھا۔(ایضاً) ظاہر ہے یہ انداز اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا تھا۔اس لیے صوفیہ کی دنیاوی معاملات یا سیاست سے دوری کو رہبانیت کے بجائے اعراض یا اقتدار کو اہمیت

نہ دینے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

ایشیائی بلکہ عالمی سطح پر ان رجحانات کی ترویج و اشاعت میں مشترک تاریخی پس منظر بھی لائق توجہ ہے۔ جو فضا ۱۲۔۱۴ ویں صدی میں قائم ہوئی، اس سے فکری میلانات کے آپسی میل جول کا راستہ ہموار ہوا اور تصوف کی روش کا فروغ ہوا۔ ایران میں عطار، سنائی، رومی، سعدی، ہندوستان میں خسرو، بوعلی شاہ قلندر، چراغ دہلوی، یحییٰ منیری، کبیر داس وغیرہ اور مغرب میں ولیم بلیک وغیرہ کا عروج اسی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

امیر خسرو اور کبیر میں مشترک اور متضاد رویے: مشترک یہ کہ دونوں روحانیت اور اس راہ سلوک میں مرشد کی رہنمائی اور انسانی قدروں کے قائل ہیں۔ دونوں اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مذاہب اور یہاں کی فلسفیانہ و تہذیبی قدروں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اور ان کے قدردان ہیں۔ دونوں راہ سلوک سے آشنا بلکہ راہ رو ہیں اور ریا اور ڈھونگ کے مخالف، عشق اور دل سوزی کے حامل ہیں اور مادی دنیا کی فنا پذیری کا استحضار رکھتے ہیں۔ دونوں شاعر اور صوفی ہیں لیکن فلسفی نہیں اور دونوں کے یہاں خدا کی اور اس تک پہنچانے والے مرشد یا گرو کی تعریف ملتی ہے۔ لیکن دونوں کی لفظیات اور طرز بیان میں فرق ہے اور اس کی وجہ تاریخی اور سماجی ہے۔ فارسی کی صوفیانہ شاعری میں ایرانی روایات کے مطابق خدا ایک دوشیزہ ساقی ہے جس کے حسن و جمال کے مختلف رنگ و آہنگ عاشق کو فریفتہ اور از خود رفتہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم پس ازاں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

اس کی تاریخی وجہ یہ ہے کہ فارسی ادب کا احیاء درباروں میں ہوا اور یہ ایرانی جمالیاتی حس کے عین مطابق ہے جب کہ کبیر کے یہاں محبوب حقیقی یا خدا کو شوہر کی اصطلاح میں پکارا گیا ہے، جو ہندوستانی روایت اور مزاج کا عکاس ہے، جہاں ایک عورت اپنا سب کچھ اپنے پتی پر نچھاور کر دیتی ہے۔ لیکن وہی خسرو جب ہندوی میں شعر کہتے ہیں تو پھر ان کے یہاں دونوں روایات کا سنگم نظر آتا ہے، جو غالباً ہندوی میں ایک نیا تجربہ ہے۔ مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

گوری سووے سیج پر رخ پر ڈارے کیش چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

تو وہ فارسی روایت کی پابندی کر رہے ہوتے ہیں اور جب ہندی کلام اور اس میں اپنے

تخلیقی تجربے برتتے ہیں تو ''سکھی'' اور ''ساجن'' کی اصطلاح لے کر آتے ہیں جہاں وہ خالص ہندی روایت کی پابندی کرتے ہیں۔

متضاد رویوں میں یہ بھی ہے کہ خسرو establishment یا حکومتوں کے وفادار ہیں اور ان کے تیور میں افراطی یا متشدد رویہ نظر نہیں آتا اور وہ گرد و پیش کے واقعات کا بہ دقت مطالعہ تو کرتے ہیں اور اس کی خامیوں اور خوبیوں سے بخوبی واقف بھی ہیں لیکن اس پر براہ راست تنقید نہیں کرتے۔اس کے دو سبب نظر آتے ہیں:

۱-ایک تو یہ کہ وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ اصل معاملہ تو یہ ہے کہ خلق عالم اپنے خالق سے وابستہ ہو جائے اور اس کے بعد تمام فساد و خلفشار از خود حل ہو جائے گا اور یہی اہل تصوف کا طریقہ ہے۔ ۲-دوم یہ کہ جب انسان کے اندر جذبۂ عشق و محبت جاگتا ہے تو باقی تمام باتیں ہیچ نظر آتی ہیں خسرو کا مشاہدہ عشق حقیقی کے حوالے سے اپنے مرشد حضرت محبوب الٰہی اور مجازی کی شکل میں کیقباد اور خضر خاں کے یہاں نظر آتا ہے، کہتے ہیں:

مراد اہل حقیقت لباس ظاہر نیست کمر بخدمت سلطاں بہ بند و صوفی باش

اس کی وضاحت صاحب سیر الاولیاء نے ان الفاظ میں کی ہے:

''سلطان الشعراء، برہان الفضلاء امیر خسرو شاعر رحمۃ اللہ علیہ کہ گوے سبقت فضل از متقدمان و متاخران بردہ بود و باطنے صاف داشت۔طریقۂ اہل تصوف در صورت و سیرت او پیدا بود، گرچہ تعلق بہ بادشاہان داشت''۔(۴)

چنانچہ ایک جگہ خسرو کہتے ہیں کہ:

غمت با این و آن گفتم نہ گفتم اگر چہ ترک جاں گفتم نہ گفتم
ترا جان گفتم از دل در تو دانی کہ من آن از زبان گفتم نہ گفتم

اسی سوزِ دروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

عطا کن شورِ رومی سوزِ خسرو عطا کن صدق و اخلاص سنائی

اگر چہ فکری اعتبار سے فلسفیانہ اور معاشرتی مسائل کے بارے میں ان کی رائے انقلابی ہے، جس کے اثرات ان کے بعد دیکھے جا سکتے ہیں، کبیر ان میں سے ایک ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان ٹائم اور اسپیس یا زمان و مکان سے ماوراء کچھ سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اس لیے اگر کوئی شخص ایک نظریہ یا رائے یا کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے لیے وہ خاص زمان و مکان اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی بادشاہ یا امیر یا کسی شخص کو گنہگار سمجھ کر اس پر لعن طعن یا تنقید و تنقیص نہیں کرتے اور اسی لیے ان کو جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی کے ساتھ وابستگی میں یا اس کی تعریف کرنے میں کوئی اخلاقی قباحت پیش نہیں آتی۔ اسی طرح ان کی زندگی کے مختلف واقعات اس کا بین ثبوت ہیں۔ یہ بھی استغنا کی ایک شکل کہی جا سکتی ہے۔

اس کے برعکس کبیر باغی ہیں اور ان کے یہاں سخت لب و لہجہ میں سماج میں مذہبی ڈھونگیوں کی اجارہ داری، حکومت اور سیاست کی ایسے لوگوں کی پشت پناہی کے خلاف اعلان بغاوت ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ''نرگن'' رویہ یہاں نہایت علامتی رویہ ہے جو گہرے فلسفیانہ اور سیاسی وسماجی معنویت کا حامل ہے۔ ایک طرف یہ اسلام کے اس فلسفہ کی تصدیق کرتا ہے جس کی توضیح کلمۂ طیبہ اور سورۂ اخلاص میں کی گئی ہے کہ خدا ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، اس کی کوئی مادی شکل و شبیہ نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی خاندان ہے۔ تو دوسری طرف ہندوستانی معاشرہ میں مختلف خداؤں کے مختلف شکلوں کے ساتھ ساتھ ان کے پرستاروں کے ذریعہ بنائے گئے سماجی ڈھانچہ کا بھی منکر ہے اور اس کی پشت پناہی کرنے والی حکومتوں کا بھی۔ چنانچہ اس اعتبار سے صوفیہ اور سنت یکساں نظر آتے ہیں کہ وہ بادشاہوں، حکومتوں سے بےتعلق اور مستغنی ہیں مگر عوام سے وابستہ۔

خسرو کے تعلق سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی صوفی نہیں تھے، بلکہ درباری محض تھے، جو ان کی ظاہری ملازمت اور درباروں سے ان کی وابستگی کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا سیدھا اور سطحی تجزیہ ہے۔ خود ان کی زندگی اور ان کے معاصرین بہ شمول حضرت نظام الدین اولیاء کی تحریروں اور بیانات سے اس کے ثبوت ملتے ہیں کہ ان کا باطن عرفان الٰہی سے منور تھا اور وہ سوختہ دل صوفی تھے۔ جن معاصرین نے ان کے صوفی اور صاحب حال ہونے کی گواہی دی ہے ان میں خاص طور سے چراغ دہلوی، میر خورد، راجکمار ہردیو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ چشتیہ سلسلے کے ایک عظیم صوفی سے وابستگی کے باوجود وہ دربار سے وابستہ رہے اور اس سے بھی بڑا سوال یہ کہ خود اولیاء نے کیوں کر انھیں اجازت دی اور پھر یہ کہ وہ

دربار اور درباداری سے وابستہ رہ کر بھی کس طرح صوفی طبیعت رہ سکے۔ظاہر ہے یہ شواہد ہمیں انھیں صوفی ماننے میں تردد پیدا کرتے ہیں لیکن یہ قابل لحاظ ہے کہ امیر خسرو خاندانی طور پر ایک ایسے گھرانے سے تھے، جو ہمیشہ دربار سے وابستہ رہا، اس وابستگی اور حکومت و اقتدار کے بقا و فنا کی تماش بینی نے انھیں دربار نظام الدین اولیاء کی طرف کھینچا تھا۔ان کے لیے دربار میں ہونا ایسا ہی تھا جیسا کوئی بھی دنیاوی کام جو صرف تعیش اور لہو ولعب ہی کے لیے خاص نہ ہو۔وہ دراصل ''خلوت درانجمن'' کا نمونہ تھے اور اسی لیے دنیا اور دربار کے تماشے ان کے لیے ایک خواب بے حقیقت کی مانند تھے۔

دوسری طرف کبیر کا رشتہ اس سلسلے سے بھی ہے، جو شنکراچاریہ (۷۸۸ء-۸۲۰ء) سے جاملتا ہے۔شنکراچاریہ کی تحریک کا مقصد پورے برصغیر کو فلسفیانہ اور مذہبی وحدت کے رشتے میں پرونا تھا اور اصل مقصد اسلام کے ان فلسفیانہ اثرات کا تدارک تھا جن کی قوت ان اسلامی تعلیمات میں تھی جو تمام بنی نوع انسان کو خدا کی نگاہ میں مساوی ہونے کا قرار دیتی ہیں، اسی تصور نے ایران جیسی عظیم سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں اور ایران قلیل مدت میں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔چنانچہ اس سلسلے کے بھکتی تحریک کے بزرگوں نے شد و مد کے ساتھ ایسے افراد کو اپنے حلقۂ شاگردی میں شامل کیا، جن کا تعلق سماج کے نچلے طبقے سے تھا اور ان کے ذریعے ایک نئی مذہبی و روحانی تحریک کی بنیاد ڈالی جو اسلامی تعلیمات کی روشنی سے فیضیاب یا متاثر تو تھی لیکن اس کی تہذیبی جڑیں برہمنیت سے پیوستہ تھیں۔چنانچہ کبیر پنتھ کا موجودہ فکری و تہذیبی منظرنامہ برہمنیت کے شکار بودھزم جیسا ہے کیونکہ تاریخی طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ برہمنی رویہ ایک یہ بھی رہا ہے کہ اس میں تغیر اور تبدل کی کچھ گنجائش رکھی جاتی ہے۔

لیکن یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ فلسفیانہ اور سماجی تحریک کی ان دو دھاراؤں نے تفہیم و تفاہم بین المذاہب کا ایک موقع فراہم کیا امیر خسرو اور کبیر داس کے خیالات، رویوں اور ان کے عملی مظاہر نے تصادم کے امکانات کو جس طرح کمزور کیا اور اسلام اور ہندوستانی مذہبی عقائد اور فلسفوں کے مشترک اور غیر متصادم عناصر کے باہمی تبادل اور میل جول کے راستے کو ہموار کیا۔وہ بہرحال ایک حقیقت ہے صوفی اور بھکتی میں اسلام، زرتشتی اور فلسفہ ہندی کے عناصر کا مطالعہ اس کا شاہد ہے۔

سفرنور یا ترکی کی ایک جھلک

ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس

ترکی میں سیکولر نظریات نے ڈیرے ڈالے تو فکر اسلامی کے احیاء کے لیے جن شخصیات نے اذیت و مصائب کے اندھیروں میں عزیمت و استقامت کی شمع بجھنے نہ دی، ان میں ایک تابندہ شخصیت استاد بدیع الزماں سعید نورسی (م:۱۹۶۰) کی ہے۔ نورسی نے اپنی تحریروں اور شخصیت کے ذریعہ اس معاشرہ میں انوار الٰہی کی تابندگی بکھیرنے کا فریضہ جاری رکھا۔ انہوں نے قرآن کو اپنی فکر کی اساس بنا کر جدید ذہنوں کے شبہات کو دور کیا، ان کے عقلی اور تمثیلی انداز تحریر نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ ان کی کتابیں رسائل نور کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ ۲۹/ جون کو ترکی جانے کا اتفاق ہوا، کمال اتاترک ایئرپورٹ استنبول کی وسعتیں اور انتظام قابل ستائش تھا۔ استنبول سے فراغت کے بعد اگلی منزل تافشند تھی۔ رات ایک بجے بس سے اترا تو طلبائے نور کی ایک کثیر تعداد نے استقبال کیا سات گھنٹے کے اس طویل سفر میں مجھے اس قوم کی اپنی زبان سے عقیدت و محبت کا اندازہ ہوا یہ قوم اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان بولنا قطعاً پسند نہیں کرتی۔ ایک نوجوان میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا طویل خاموشی کے بعد مجھ سے سوال کیا کہ تمھیں کون سی زبان سمجھ میں آتی ہے میں نے کہا عربی یا انگلش سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے مجھ سے انگلش میں گفتگو شروع کی مگر ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد وہ موبائل میں موجود لغت کا سہارا لیتا۔ اس کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان کے ہاں یونیورسٹیوں میں ''کریڈٹ آور'' کی جگہ ''لائسنس'' کی اصطلاح رائج ہے۔

تافشند میں اگلے دن اہل علم کے ایک گروہ سے ملاقات میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ کئی مسائل پر نقطہ نظر کے اختلاف کے باوجود یہ اندازہ ہوا کہ مختلف دینی موضوعات پر مطالعہ

چیئر مین شعبہ عربی، اسلامیات گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد۔

اور تحقیق کا شوق بہرصورت ان میں موجود ہے۔ طلبائے نور کے اسی طرح کے اجتماعات کے لیے باقاعدہ عمارتیں حاصل کی گئی ہیں جن کو ''درس خانہ'' اور مختصر الفاظ میں ''درسانہ'' کہتے ہیں۔ ان درسانوں میں رسائل نور کا مطالعہ و درس اور تربیت کا اہتمام ہوتا ہے۔ ان درسانوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ شاید ''خانقاہ'' کا قدیم تربیتی و تعلیمی نظام تھا جو اب درسانوں میں جاری ہے ان درسانوں کا انتظام و انصرام مقامی لوگوں کے ذمہ ہے۔ ایک ایسا درسانہ بھی دیکھا جس کے ساتھ خوبانی اور چیری کا بڑا باغ تھا اور اس کی آمدنی درسانہ کے لیے وقف تھی۔ ان درسانوں میں مہمانوں کی خدمت ''طلبائے نور'' کے ذمہ ہے۔ عموماً بڑے درسانوں میں ایک ''بزرگ'' شخصیت ہوتی ہے جس کی نگرانی میں تمام امور مکمل ہوتے ہیں۔ ان نگرانوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو ''وقف'' ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ شادی بھی نہیں کرتے۔ ان کی دلچسپیوں کا مرکز صرف درسانہ ہوتا ہے۔ ان کو ترکی میں ''ابے'' (بڑا بھائی) کہتے ہیں۔ ایک شہر میں کئی کئی درسانے فکر نورسی کو عام کرنے کے لیے قائم ہیں جبکہ خواتین کے بھی علاحدہ درسانے ہیں۔ موسم سرما کی چھٹیوں میں یہاں معلموں، بزرگ شہریوں اور بچوں کے لیے مختصر مدت کے تربیتی کورس بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں طلبہ کو فکری طور پر مضبوط کیا جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی کورس پر آئے ہوئے ۸۔۹ سال کے بچے سے میں نے پوچھا کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ کہنے لگا ''استاد نورسی'' ایک دوسرے بچے کے ہاتھ میں مسواک دیکھ کر سوال کیا کہ تم برش استعمال کیوں نہیں کرتے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ سنت ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان درسانوں میں تعلیم و تربیت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کا اہتمام موجود ہے۔

سعید نورسی سے لوگوں کو روحانی عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رسائل نور کو لوگوں نے گویا وظیفہ حیات بنا لیا ہے ان رسائل کے حوالے سے تین مختلف طبقات یہاں موجود ہیں۔ ایک مطالعاتی طبقہ یا گروپ ہے جو قرآن کے بعد ان رسائل کا مطالعہ ضروری خیال کرتا ہے دوسرا قلمی طبقہ یا گروپ ہے جو تحریری طور پر یہ خدمت انجام دیتا ہے۔ تیسرا طبقہ، فتح اللہ غولان کی جمعیت ہے جس کے پاس رسائل نور کے علاوہ بھی وقیع علمی دینی ذخیرہ موجود ہے، یہ دوسرے ملکوں میں اپنے علمی کاموں کی وجہ سے معروف بھی ہے، لیکن ان تینوں کا مشترک نقطۂ فکر ''رسائل

نور'' ہیں۔سعید نورسی سے عقیدت کا مظہر وہ مقامات بھی ہیں جن سے ان کی کسی حوالے سے نسبت رہی۔حکومت وقت نے سعید نورسی کو سزا کے لیے مختلف مواقع پر مختلف جگہوں پر رکھا تھا۔ ان سب کو محفوظ کیا گیا ہے۔اسپارٹا میں وہ درخت موجود ہے جس پر بیٹھ کر سعید نورسی نے رسائل نور تحریر کئے اسی درخت کے ساتھ ہی وہ مکان ہے جس میں انہیں بطور سزا رکھا گیا،اب لوگ اس جگہ زیارت کے لیے آتے ہیں۔اسپارٹا قدیم شہر ہے کہا جاتا ہے کہ اس کے پہاڑوں سے عیسیٰ علیہ السلام کے حواری گزرے تھے،دوسرا مقام جہاں نورسی کے زیر استعمال چیزیں رکھی گئی ہیں برلا ہے۔یہاں کا مکان اب وقف کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کا بستر،لباس،چائے کا سامان،زیر استعمال گاڑی سب یہاں موجود ہے۔نورسی تبرکات کا تیسرا مقام سن لی عرفہ ہے،اس جگہ ان کی چیزوں کے علاوہ ایک سفید جبہ ہے جس کے بارے میں طلبائے نور میں یہ روایت مشہور ہے کہ یہ حضرت خالد کردیؒ کا جبہ ہے جس کے لیے انہوں نے وصیت کی تھی کہ میرے بعد آنے والے سعید کو پہنچانا اس وصیت کے مطابق ان کی اولاد نے اسے سعید نورسی تک پہنچایا۔

ان مقامات پر طلبائے نور اور دیگر شہریوں سے ملاقات کے بعد یہ تاثر سامنے آیا کہ ترکی عوام کے دل میں پاکستان بلکہ پورے برصغیر کی انتہائی عزت وتوقیر ہے۔ان لوگوں کو وہ تعاون اور ہمدردی آج بھی یاد ہے جو برصغیر کے مسلمانوں نے تحریک خلافت کے دوران ان سے کی تھی۔

اس سفر کے دوران ملانیہ میں Anonu یونیورسٹی کے الہیات کے شعبہ کے اساتذہ سے ملاقات بھی ہوئی۔ان اساتذہ نے پاکستانی یونیورسٹیوں سے اشتراک عمل پر خوشی کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ دونوں ادارے (جی سی یو فیصل آباد اور Anonu یونیورسٹی) اس سلسلہ میں دفتری ضابطے پورے کریں گے۔یونیورسٹی کے وائس ریکٹر ڈاکٹر اسماعیل ادمیر سے بھی ملاقات ہوئی۔انہوں نے بتایا کہ یونیورسٹی میں اس وقت طلباء کی تعداد ۲۵ ہزار ہے ڈاکٹر اسماعیل نے انتہائی مصروفیت کے باوجود تقریباً بیس منٹ ملاقات کی جس میں اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے مختلف معاملات زیر بحث آئے۔یونیورسٹی کی عمارت انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔نماز کے لیے اس یونیورسٹی میں مسجد کی موجودگی یقیناً بہت ایمان افروز تھی۔

ملاتیہ محمد درغان چوغان کے ایک عزیز کا انتقال ہوگیا۔ ہم ان کے ہاں تعزیت کے لیے گئے۔ وہاں تعزیت کا یہ رواج ہے کہ تعزیت کے لیے جانے والا قرآن کریم کا کچھ حصہ تلاوت کرتا ہے اور پھر سب دعا کرتے ہیں۔ یہاں تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمیں بھی کھانے کی پیش کش کی۔ گھر کے مالک نے ہمارے پاکستانی ہونے کی وجہ سے اپنا غم بھول کر ہماری انتہائی تعظیم کی۔

''سن لی عرفہ'' نامی علاقہ میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس جگہ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے نمرود نے آگ جلائی تھی۔ بلند و بالا پہاڑ پر دو مینار اب بھی نظر آرہے ہیں کہا جاتا ہے یہاں منجنیق میں ڈال کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نیچے پھینکا گیا۔ یہ جگہ کافی فاصلہ پر اور نیچے واقع ہے۔ آگ والی جگہ پر اس وقت پانی کا ایک تالاب ہے۔ اس میں سیاہ رنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں یہاں کے لوگوں میں یہ بات مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو گلزار بنا دیا اور اس آگ کو اکٹھا کر کے اس مچھلی میں رکھ دیا۔ واللہ اعلم۔ اسی پہاڑی سلسلہ میں ایک غار کے بارے میں بتایا گیا کہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ اس غار کو شیشہ سے بند کر دیا گیا ہے۔ بدیع الزماں سعید نورسی کی قبر بھی ابتداء میں اسی جگہ بنائی گئی۔ مگر بعد میں طلبائے نور نے اسے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا۔ اور آج کسی کو علم نہیں کہ نورسی کی قبر کہاں ہے۔ اس قبر کے سامنے والے برآمدوں میں قادری سلسلہ کے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ دوسری طرف جہاں آگ گلزار ہونے کی روایت مشہور ہے وہاں قریب ہی شاذلی سلسلہ کے ایک بزرگ محو استراحت ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عرب ممالک سے صوفیہ یہاں آئے جس کے نتیجہ میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی علاقہ کے قریب Adyaman نامی شہر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہاں جبل نمرود ہے۔ نمرود سال کا کچھ حصہ یہاں گذارا کرتا تھا۔

یہاں سے رات گئے ملاتیہ واپس آئے۔ وہاں اس دن پندرہ شعبان کی رات تھی۔ راستے میں مساجد میں لوگوں کا معمول سے زیادہ رش دیکھنے میں آیا۔ طلبائے نور نے اس رات شب بیداری کی۔ اب تک کے سفر میں مغربی ترک دوست محمد دوغان جو اردو بھی جانتے ہیں ہمیں مختلف پروگراموں میں شرکت کے لیے لے جاتے رہے اور پروگراموں میں ترجمانی کا

فریضہ بھی انجام دیتے رہے وہ ملاتیہ ائیر پورٹ پر مجھے رخصت کر گئے اور میں استنبول کی طرف روانہ ہوا تقریبا ایک گھنٹہ اور پچیس منٹ کی پرواز کے بعد میں استنبول میں کمال اتاترک ایئرپورٹ پر تھا یہاں جناب محمد سعید اور یعقوب موجود تھے۔محمد سعید پاکستانی ہیں اور ترکی میں کاروبار کرتے ہیں۔ترکی زبان پر مہارت حاصل ہے جبکہ یعقوب وہاں ایک طالب علم ہیں محمد سعید کچھ عرصہ ساتھ رہے اور پھر کاروباری ملاقات کے لیے چلے گئے جبکہ مرمرہ یونیورسٹی کے عبدالکریم جو وہاں ٹیچنگ اسسٹنٹ ہیں، گاڑی لے کر آئے اور ہمارے دو دن ان دونوں کے ساتھ گذرے۔

یہاں بلیو مسجد، توپ کاپی میوزیم، ایا صوفیہ اور دیگر اہم تاریخی عمارات دیکھیں۔ان عمارتوں اوران میں موجود نوادر کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا ہے کہ ہم کیا تھے؟ اور کیا ہو گئے؟ کوئی قوم جب طاقت اور قوت کی مالک ہوتی ہے تو انداز کیا ہوتے ہیں اور مغلوب کی سوچ اور فکر کیا ہوتی ہے! یہاں مجھے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار اقدس پر حاضر ہونے کا شرف بھی ملا۔ یہ حاضری میرے لیے سرمایہ اور باعث فخر تھی۔ میں میزبان رسولؐ کے قدموں میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کو اشاعت دین کی فکر کس قدر تھی؟ سلطان ایوبؓ نے (ترکی میں حضرت اسی نام سے مشہور ہیں) حرمین شریفین کی سرزمین کی بجائے اس جگہ دفن ہونا پسند کیا۔سمندر کے کنارے یہ قدیم قبرستان ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قبرستان میں یقیناً تابعین بھی مدفون ہوں گے مگر ان کا ابھی تک علم نہیں استنبول میں عبدالعزیز گیلانی سے ملاقات بھی ہوئی یہ ڈاکٹر فاضل گیلانی کے بیٹے ہیں ڈاکٹر فاضل گیلانی نے شیخ عبدالقادر گیلانیؒ کی کتابوں کو جواب تک مخطوطات کی شکل میں تھیں، تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع کیا ہے۔تفسیر جیلانی بھی ان میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر فاضل وہاں موجود نہ تھے البتہ عبدالعزیز نے ہمیں شیخ گیلانی کی یہ تمام کتابیں پیش کیں۔ مجھے مکتوبات امام ربانیؒ کے ترکی ترجمہ کی تلاش تھی۔اس کے لیے میں نے بعض کتابوں کی دکانیں دیکھیں۔ان لوگوں نے مصنف ابن ابی شیبہ کا ترکی ترجمہ بھی تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہم اور بنیادی ماخذ یقیناً ترکی زبان میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ یہاں سے مجھے مکتوبات امام ربانی کا عربی ترجمہ بھی ملا جو بیروت والے

ترجمے کے علاوہ تھا۔ مجموعی طور پر ترکی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لوگوں کو انتہائی عقیدت و محبت ہے اور وہ امام ربانی کے نام سے معروف عام و خاص ہیں۔

ایک ہفتہ ترکی میں گذارنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ترکی کے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آج بھی مذہبی عقیدت و وارفتگی کے ساتھ جی رہی ہے۔ اگر مذہبی گروپ اکٹھے ہو جائیں تو ایک انقلابی تبدیلی آسکتی ہے۔ نوجوان نسل اسلامی روایات کی طرف واپس آ رہی ہے "یورپی تہذیب کے برہنہ اثرات" اس نسل کی حکمت عملی اور کاوش سے ختم ہو سکتے ہیں۔ یہ قوم علم دوست ہے اس کی علم دوستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی کرنسی نوٹ کے ایک طرف علم کی دنیا میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کی تصویر ہے مثلاً ۵ لیرا پر ord.prof.Dr.Aydin Sayili (م:۱۹۹۳) اور ۱۰ لیرا پر ord. Prof.Fr.Chait Arf (م:۱۹۹۷) کی تصویر ہے جنہوں نے فزکس اور ریاضی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ کرنسی نوٹ پر یہ تصاویر ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ہیں حق یہ ہے کہ علم کی قدر دان قوم ہی قیادت و سیادت کی اہل ہو سکتی ہے۔

اخبار علمیہ

''فلپائنی زبان میں قرآن کی پہلی تفسیر''

خلیجی ممالک میں اس وقت دوملین فلپنی باشندے ملازمت کے مقصد سے مقیم ہیں، وہاں قبول اسلام کے واقعات میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔اسلام سے ان کے اس تعلق کے پیش نظر سعودی عرب کی وزارت امور مذہبی نے دس برس قبل فلپائنی زبان میں تفسیر شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جو پچھلے دنوں مکمل ہوا، اس کے لیے متعدد علماء اور محققین کا جن میں چار خواتین بھی شامل ہیں انتخاب کیا گیا تھا، ان کے علاوہ فلپائن نژاد معاونین بھی شریک تھے، سربراہ فواد کوثر تھے، ۱۳۸۰ صفحات پر مشتمل اس تفسیر کے بیس ہزار نسخے تیار کرائے گئے، جن میں ۴۰ فیصد سعودی عرب کے لیے مختص کیے گئے ہیں، ۶۰ فیصد فلپائن سمیت دوسرے ملکوں میں بھی بھیجے گئے ہیں۔دولاکھ ۴۰ ہزار ڈالر کا خرچ طباعت پر آیا، الحمدللہ فلپائن میں اس تفسیر کو خاصی مقبولیت مل رہی ہے، طلبہ وطالبات نے اس پر مقالات تحریر کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔توقع ہے کہ اس سے فلپائن میں علوم قرآنی سے دلچسپی اور اسلام کی روشنی میں اور اضافہ ہوگا۔

''معذور شیریں تبسم نصاب میں شامل''

مراٹھی روزنامہ ''سکال'' ناگپور نے گذشتہ سال دونوں ہاتھ اور ایک پیر سے معذور شیریں تبسم نامی لڑکی کے متعلق ایک خبر ''ایکچ پاول۔پن پڑے پوڑھے'' (ایک ہی پیر لیکن بڑھے آگے) کے عنوان سے شائع کی تھی، اب مہاراشٹر تعلیمی، تحقیقاتی وتربیتی بورڈ نے مراٹھی میڈیم کی نویں جماعت کی انتر بھارتی نامی کتاب میں ''ہوئے ملا جنیکا'' کے زیر عنوان اس تحریر کو شامل نصاب کیا ہے، شیریں ایوت محل کے اسلام پورہ کی رہنے والی ہے، اس کی ہمت اور حوصلہ کو دیکھ کر ''گیری گورو'' اور یونیسیف وغیرہ کی جانب سے کئی اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے، بعض تنظیموں نے اس کی مالی اعانت اور تعلیم سے فراغت کے بعد ملازمت کی پیش کش بھی کی ہے۔ نصاب میں شیریں کے حالات زندگی کو شامل کرنے کا مقصد اس کی شخصیت کو مثالی شکل میں بچوں

میں متعارف کرانا ہے۔

''عمرؓ نامی سیریل''

سعودی پروڈیوسرس اور مرکز برائے نشریات مشرق وسطی کے بیان کے مطابق ۱۰ ممالک سے منتخب تکنیکی ماہرین کی ایک ٹیم نے ۳۳۰ دنوں کی انتھک محنت کے بعد ۳۱ قسطوں پر مشتمل ''عمرؓ'' نامی سیریل بنایا جس میں تیس ہزار اداکاروں نے مختلف کردار ادا کیے۔ جب عالم عرب میں اس کو نمائش کے لیے پیش کیا گیا تو ہزاروں افراد نے اس پر فوری پابندی کا مطالبہ کیا۔ جامعہ ازہر نے اس کے خلاف فتوی میں کہا کہ اسلام میں آنحضورؐ اور صحابہ کرامؓ کی تجسیم اور خاکہ کشی ممنوع ہے، سعودی عرب کے دارالافتاء نے بھی اپنے فتوی میں کہا کہ قرآن میں عینی خاکہ بندی پر گرچہ صراحتاً امتناع نہیں تاہم سنی علماء اس نکتہ پر متفق ہیں کہ دینی شخصیات کی تجسیم ناجائز ہے۔ اس سے بت پرستی کو ہوا مل سکتی ہے جو اسلام میں قطعی حرام ہے، تاہم سیریل سازوں نے بعض علماء مثلاً مصری عالم شیخ یوسف القرضاوی وغیرہ کی تائید وحمایت کا دعوی کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے اس میں پیش کردہ تاریخی حقائق و واقعات کو صد فیصد درست قرار دیا ہے۔

''مسموم باغ''

عربی اخبار ''البیان'' کے مطابق برطانیہ میں ''ایلن وک پوائزن گارڈن'' دنیا کا واحد مسموم باغ ہے۔ زہریلے پودوں کے نقصانات اور اس کے اثرات سے لوگوں کو واقف کرانے کے مقصد سے اس میں ۱۰۰ سے زیادہ پودے لگائے گئے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں نارتھمبر لینڈ کے مشہور قلعہ میں اس کو شہر کے میئر نے یہ باغ لگایا تھا۔ سیاحوں کے لیے مرکزی دروازے پر احتیاطی ہدایات بھی درج کی گئی ہیں، بعض پودے شیشے میں بند ہیں، کیونکہ ان کے چھونے سے ہاتھ شل اور ائزو یا بیلا ڈونا وغیرہ کو سونگھنے سے انسان حواس باختہ اور پاگل ہوجاتا ہے۔ اس میں ''ہیم لاک'' نامی پودا بھی ہے جس کا زہر اس پیالہ میں تھا جس کو سقراط نے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

''انسانی جسم میں حیاتی گھڑی''

عربی ویب سائٹ ''المحیط'' کے مطابق جرمنی کے شہر میونخ کی Ludwing University کے حیاتی ماہرین نے انسانی جسم میں ''حیاتی گھڑی'' کے سراغ لگانے کا دعوی کیا ہے جو انسان کے دماغ کے اگلے حصہ میں کھجور کے بیج کی شکل میں موجود ہے اور جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرنے اور روشنی اور اندھیرے میں مرتب ہونے والے اثرات دماغ تک پہنچانے میں معاون ہوتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق جو بچے تاخیر سے سوتے ہیں وہ چڑ چڑے پن اور قوت برداشت سے محرومی کے شکار ہوتے ہیں، اس عارضے میں بنیادی کردار اسی حیاتیاتی گھڑی کا ہے، غذا کے علاوہ معمولات کے اثرات بھی دماغ پر پڑتے ہیں، دیر تک جاگنے سے دماغ کے اس حصہ پر براہ راست منفی اثر پڑتا ہے جس کا تعلق انسانی صحت سے ہوتا ہے۔ ۵۵ ہزار لوگوں پر تحقیق کر کے معلوم ہوا کہ جو افرادرات کو جلدی سو کر پچھلے پہر اٹھ جاتے ہیں اور ہلکی پھلکی ورزش بھی کرتے ہیں تو وہ تروتازہ رہتے ہیں، ان کے چہرے پر جھریاں بھی نہیں دکھائی دیتیں اور وہ جلد بوڑھے نہیں ہوتے، مصر کے ماہر حیاتیات ڈاکٹر ہانی المنصور نے اس تحقیق سے بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تہجد کے اہتمام سے بڑھاپا جلد نہیں آتا۔

''اللہ، آزادی اور محبت'' پر حکم امتناع''

پاکستان نژاد کنیڈا کی رہنے والی ارشادی منجی نامی مصنفہ نے اس سے قبل ''اسلام کی کمزوریاں'' کتاب لکھ کر اسرائیل کے کسی ناشر سے شائع کروایا تھا۔ اب اسی مصنفہ نے ''اللہ۔ محبت اور آزادی'' نام سے کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اسلام اور مسلم معاشرہ کے تضادات کو موضوع بنا کر اسلامی روایات کا استہزاء کیا گیا ہے۔ ملیشیا کی وزارت داخلہ نے مسلمانوں کے احتجاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی خرید وفروخت اور نشر وطباعت پر قانوناً پابندی عاید کردی ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو خطیر جرمانہ اور تین سال کی قید ہوسکتی ہے۔ (صراط مستقیم، برمنگھم)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

الحصن المتین

شعبہ عربی، اے ایم یو
علی گڑھ
۱۶/ جولائی ۲۰۱۲ء

محترم مکرم زید لطفکم سلام مسنون

جون کے معارف میں برادر محترم ڈاکٹر اجمل اصلاحی صاحب کا گرامی نامہ نظر سے گزرا۔ اپنی کم علمی بلکہ بے علمی کا اکثر مواقع پر احساس ہوتا رہتا ہے۔ قاہرہ کے مطبوعہ نسخہ ۱۹۹۳ء کا علم خاکسار کو قطعی نہ تھا۔

اس وقت **الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین** سے متعلق اپنا مضمون پیش نظر نہیں غالباً اس میں سہو قلم ہوا ہے۔ احقر نے نیشنل آرکائیوز میں جو نسخہ دیکھا تھا وہ دو رجسٹروں پر تھا، ابتداء میں کاتب نے **الحصن المتین فی تاریخ السلاطین** لکھا تھا مگر مولف نے "**وسمیتھا بالحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین**" لکھا تھا۔ اس میں کل ۲۹۳ صفحات تھے، نقل کے آخر میں پنسل سے یہ عبارت بھی مرقوم تھی کہ نقل کا کام ۲۰/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ختم ہوگیا۔ خاکسار کو یہ لکھنا تھا کہ نیشنل آرکائیوز کے نسخہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا مقابلہ حیدرآبادی نسخہ سے بھی کیا گیا ہے۔ جو بخط نسخ اور ۱۷۵، اوراق پر مشتمل ہے۔ آصفیہ میں صرف باب اول موجود ہے، بہرحال احقر برادر محترم موصوف کا بہ صمیم قلب ممنون ہے۔

محتاج دعا

(پروفیسر) مسعود انور علوی

باب التقریظ والانتقاد

احسن البیان فی علوم القرآن

از ڈاکٹر حسن الدین احمد، کتابت وطباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۲۲، قیمت ۵۷۱روپے، ناشر: اسلامک بک سروس، 74-2872کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

علوم القرآن کے موضوع پر عربی زبان میں متعدد بلند پایہ کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے امام جلال الدین سیوطی کی کتاب ''**الاتقان فی علوم القرآن**'' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اوراب بھی متداول ہے۔اردو میں اس موضوع پر کم کام ہوا ہے۔محمد تقی عثمانی کی کتاب '' **علوم القرآن**'' اور قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی کی ''**عیون العرفان فی علوم القرآن**'' قابل ذکر ہیں۔اس سلسلۂ زریں میں ڈاکٹر حسن الدین احمد کی کتاب ''**احسن البیان فی علوم القرآن**'' ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

یہ کتاب سولہ اہم موضوعات قرآن پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں، قرآن مجید، علم کتابت، علم تجوید وقرأت، تدوین قرآن، علم ترتیب نزول، علم اسباب نزول، علم معانی، علم اعجاز، علم تفسیر، علم ترجمۂ قرآن، علم تفہیم، فہم قرآن میں احادیث وروایات کا مقام، حروف مقطعات، محکمات ومتشابہات، ناسخ ومنسوخ، کتب مقدسہ اور تحریف۔ان کے علاوہ سات ضمیمے بھی ہیں: فہرست کاتبان وحی، فہرست ترتیب نزول، فہرست لغات قرآن، قرآن مجید کے عجمی الفاظ، قرآن مجید اور علامات، حروف مقطعات ایک اقتباس، عکس مکتوب ڈاکٹر حمید اللہ۔موضوعات اور ضمیمے کی اس تفصیل سے بالکل واضح ہے کہ علوم القرآن پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔

اس کتاب کے لکھنے کا مقصد جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے ''قرآن مجید کے مطالعہ سے دلچسپی پیدا کرنا اور متن قرآن سے راست استفادہ کی راہ ہموار کرنا ہے'' (دیباچہ)۔فاضل مصنف اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں۔انہوں نے بہت سے جلیل القدر علماء اور مفسرین کی کتابوں سے اخذ واستفادہ کرکے علوم قرآن سے متعلق بڑا بیش بہا مواد اکٹھا کردیا ہے جو قرآن اور اس کے

علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگا اور فہم قرآن میں ان کی رہنمائی کرے گا۔

ہر کتاب کی طرح خواہ اس کا مصنف کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ڈاکٹر حسن الدین احمد کی اس کتاب میں بھی چند نقائص موجود ہیں۔اس کا ایک قابل ذکر نقص یہ ہے کہ مختلف موضوعات کے تحت جو معلومات جمع کی گئی ہیں ان کو موزوں ترتیب سے پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ سے مختلف مباحث میں خیالات اور مضامین کی تکرار ملتی ہے۔اس کے علاوہ علماء اور مفسرین کے جو اقوال و آراء نقل کیے گئے ہیں ان پر بہت سے مقامات پر نقد و محاکمہ نہیں کیا گیا ہے۔اس بنا پر ایک قاری کتاب کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کون سا قول راجح اور اقرب الی الصواب ہے اور اگر سارے اقوال مرجوح ہیں تو قول راجح کیا ہے۔

کہیں کہیں تضاد بیان بھی پایا جاتا ہے۔مثلاً ''اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ویسا کوئی وعدہ احادیث نبویؐ کی حفاظت کا نہیں فرمایا۔خود رسول اکرمؐ نے جو خصوصی اہتمام قرآن مجید کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا احادیث کے لیے نہیں کیا۔اس وقت افسوسناک صورت حال جو ایک امر واقعہ ہے یہ ہے کہ وضعی احادیث بھی راہ پا گئی ہیں''۔(ص ۳۱۹) لیکن آگے چل کر اسی غیر محفوظ ذخیرۂ حدیث کے متعلق لکھا ہے ''سچ تو یہ ہے کہ پورے ذخیرۂ حدیث سے قرآن کی تفسیر میں مدد لینی چاہیے''۔(ص ۳۳۰)

فاضل مصنف کا یہ خیال بھی محل نظر ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے دین کے نفاذ کے سلسلہ میں صرف قرآن مجید نازل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رسول اکرمؐ کو اس کام پر بھی مامور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کی آیات کی توضیح اور تشریح پیش کریں''۔(۳۲۶)

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید ایک غیر واضح کلام ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں اس کی ایک بڑی خوبی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ''کتاب مبین''، یعنی معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک واضح کتاب ہے۔اس کے اسلوب بیان میں کسی قسم کا ابہام اور ژولیدگی نہیں، بالکل راست انداز کلام ہے (سورۂ زمر: ۲۸)۔اس میں جہاں اجمال ہے اس کی وضاحت خود نازل قرآن نے کردی ہے: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (سورہ قیامہ: ۱۹) ''پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی شرح و وضاحت''۔

معلوم ہوا کہ قرآن خود اپنا شارح ہے اور وہ ہر پہلو سے ایک واضح کتاب ہے۔یہی وجہ ہے

کہ رسول اکرمؐ سے دو چار آیات کے سوا کوئی تفسیر منقول نہیں ہے۔ آیات احکام کی جو تفصیل حدیث کی کتابوں میں ملتی ہے اس کو معروف معنی میں تفسیر کہنا صحیح نہ ہوگا۔ وہ دراصل قرآنی احکام کے عملی قوالب ہیں۔ احادیث کو قرآنی بیانات کی تفصیل مزید یا بطور تائید لانے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مفید ہے۔

کتاب میں فاضل مصنف کے بعض ''تفردات'' بھی ہیں۔ انہوں نے قرآن کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے ''بہ لحاظ ترتیب نزول قرآن مجید کا پہلا لفظ **اقرأ** ہے۔ **اقرأ باسم ربک الذی خلق** (قرآن:۹۶۔۱) (اعلان (حق) کیجیے اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جو اقراء ہی سے مشتق ہے۔ اقراء کے معنی ہوئے (وحی الٰہی کے بموجب) کہہ، اظہار (حق) کر''۔ (ص ۸)

اقرأ کا یہ مفہوم درست نہیں ہے۔ اس کی تائید نہ لغت سے ہوتی ہے اور نہ نظائر قرآن سے۔ اقرأ کے لغوی معنی جمع و تالیف یعنی ملانے اور اس کے ثانوی معنی پڑھنے کے ہیں جس میں لغوی معنی شامل ہے (پڑھنے کے عمل میں حروف اور کلمات باہم ملائے جاتے ہیں) قرآن مجید میں یہ لفظ اصلی (لغوی) اور ثانوی دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ قیامہ کی آیت ۱۹ میں لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بہت سے مفسرین نے اسے ثانوی معنی میں لیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ راقم نے اس پر تفصیلی بحث اپنی کتاب ''تفسیر قرآن کے اصول و مسائل'' (مقدمہ تفسیر میزان القرآن) میں کی ہے۔ (دیکھیں صفحہ ۴۰ تا ۴۴) ثانوی معنی میں یہ لفظ کئی سورتوں میں استعمال ہوا ہے (دیکھیں سورۂ بنی اسرائیل ۷۸، اعراف ۲۰۴)

اقرأ کا وہ مطلب بھی صحیح نہیں ہے جو بہت سے مفسرین نے ایک روایت کی بنیاد پر بیان کیا ہے۔ اس روایت سے نبی اکریمؐ کے امی ہونے کی نفی ہوتی ہے۔ میری فہم کے مطابق ''**اقرأ باسم ربک الذی خلق**'' کا مطلب یہ ہے کہ ''اے نبی (جو وحی بھی تمہاری طرف نازل کی جائے اسے) اپنے اس خداوند کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا'' (یعنی اسے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر پڑھو)۔ اس ہدایت کے مطابق قرآن مجید کی تمام سورتوں (بجز سورۂ توبہ) کی لوح پر ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا فقرہ مرقوم ہے اور تلاوت قرآن کا آغاز اسی فقرے سے کیا جاتا ہے۔

''محکمات'' اور ''متشابہات'' کی توضیح میں فاضل مصنف نے جمہور علماء اور مفسرین کی تشریحات کے برخلاف ایک بالکل منفرد خیال پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''(اے رسول) ہم نے آپ

پر جو کتاب نازل کی ہے وہ قطعی اور حرف آخر ہے۔ اس کی آیات، الفاظ، معانی، قانون اور نفاذ قانون ہر حیثیت سے اٹل ہیں (محکمات)۔ قرآن مجید نے پچھلی کتابوں کی تمام تعلیمات کو مشفق ماں کی طرح اپنی گود میں سمیٹ لیا ہے (ام الکتاب)۔ قرآن مجید کی آیات ایسی ہیں جو پچھلی کتابوں سے ملتی جلتی ہیں (متشابہات) جن کے قلوب میں جھکاؤ (زیغ) ہے وہ ازراہ فتنہ انگیزی اور ازراہ تاویل پچھلی کتابوں ما تشابہ منہ کا اتباع کرتے ہیں جو قرآن مجید کی آیات سے ملتی جلتی ہیں حالانکہ نتیجہ کی جستجو (تاویل) فضول ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا وہ جانتے ہیں جو علم میں پختہ ہیں (راسخون فی العلم)۔ وہ ''ملتی جلتی آیات'' یعنی پچھلی کتابوں کے پیچھے نہیں پڑتے (جو لائق تعظیم تو ہیں لیکن لائق تعمیل نہیں) اور یہ کہہ کر اپنا دامن بچا لیتے ہیں کہ ہم ان پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ کتابیں بھی ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت (ذکر) تو عقل مند (اولوالالباب) ہی قبول کرتے ہیں''۔ (ص ۳۵۲)

سورۂ آل عمران کی آیت ۷ کی مذکورہ تفسیر محل نظر ہے۔ اس کی تائید نہ تو آیت کے سیاق و سباق سے ہوتی ہے اور نہ ہی نظائر قرآن سے۔ اس تفسیر میں معنوی ابہام اور تناقض ہے اور ''محکمات'' اور ''متشابہات'' کا جو لغوی مفہوم سمجھا گیا ہے وہ بھی لغت اور نظائر قرآن سے مطابقت نہیں رکھتا۔

محکمات اور متشابہات کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں جو اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح اور قطعی الدلالت ہیں، ان کو قرآن کی اصطلاح میں محکمات کہتے ہیں۔ محکمۃ (محکمات) کے معنی واضح کے ہیں۔ فرمایا ہے **فاذا انزلت سورۃ محکمۃ و ذکر فیھا القتال** (سورہ محمد۔ ۲۰) اس آیت میں ''**سورہ محکمۃ**'' کا مطلب ہے واضح سورہ جس میں صاف لفظوں میں قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے بنیادی مضامین کا تعلق آیات محکمات سے ہے اور کتاب کے اندر ان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہدایت اور ضلالت اور حق و ناحق کا فیصلہ ان ہی آیات کی روشنی میں کیا جائے گا۔

اس کے برخلاف وہ آیتیں جو تمثیلی اور تشبیہی اسلوب رکھتی ہیں اور ان کا مفہوم قطعی اور غیر مبہم نہیں ہے، متشابہات کے زمرہ میں داخل ہیں۔ متشابہ کا لغوی مفہوم اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے **ان البقر تشابہ علینا** (سورہ بقرہ: ۷۰) (بیل کا معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا) یعنی ہم (یہود)

قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جس بیل کی قربانی کا حکم دیا گیا ہے وہ فلاں بیل ہے۔ آیات متشابہات کا تعلق اللہ کی صفات اور عالم آخرت کے احوال و مقامات سے ہے۔ ان کا حقیقی علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۵ میں لفظ ''کـلـمـہ'' (یعنی بن باپ کے عیسیٰ مسیحؑ کی پیدایش) اور آیت ۵۵ میں ''واقعۂ رفع'' کا تعلق بھی آیات متشابہات سے ہے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے جن میں ڈاکٹر حسن الدین احمد بھی شامل ہیں کہ آیات متشابہات کا علم اللہ کے علاوہ ان لوگوں کو بھی ہے جن کو آیت میں ''الراسخون فی العلم'' کہا گیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔ انسان کا علم مادی خواص رکھتا ہے اور اس کے حصول کے ذرائع بھی مادی ہیں، اس لیے اس کے علم کا دائرہ، عالم مادہ ہی تک محدود ہے۔ عالم غیر مادی کے حقائق کا ادراک اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ جب بھی اس راہ میں قدم رکھے گا اس کے لیے یہ تقریباً ناممکن ہوگا کہ اپنے دل و دماغ کو شکوک و شبہات سے محفوظ رکھ سکے۔ اکثر فلاسفہ کی زندگی اور ان کے علمی کاموں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حقیقی معنی میں علم کے اندر رسوخ رکھتے ہیں وہ اس راہ میں چلنے سے گریز کرتے ہیں اور ایمان مجمل پر قناعت کرتے ہیں۔ آیت ۸ میں علم میں رسوخ رکھنے والوں کی یہ دعا مذکور ہے **ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا** (اے ہمارے رب، ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر)۔ اس دعا سے بالکل واضح ہے کہ علم میں رسوخ رکھنے والے اہل ایمان آیات متشابہات میں غور و خوض سے پرہیز کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس کا لازمی نتیجہ زیغ قلب ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین احمد کے مذکورہ ''تفردات'' کا ایک احسن پہلو بھی ہے۔ اس طرز فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''تقلید آبا'' کے قائل نہیں ہیں بلکہ قرآن کی مشکل آیات میں تدبر کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج کو بلاخوف تردید پیش کر دیتے ہیں۔ ''ناسخ و منسوخ'' کی بحث میں انہوں نے اسی علمی جرأت کا ثبوت دیا ہے اور ان اصحاب علم کی تائید کی ہے جو قرآن کی ایک آیت کو بھی منسوخ نہیں مانتے۔

امید ہے یہ کتاب اصحاب علم بالخصوص علوم قرآن سے شغف رکھنے والوں کے حلقے میں پسند کی جائے گی اور اس سے استفادہ کیا جائے گا۔

الطاف احمد اعظمی

ادبیات

غزل

وارث ریاضی

ترے تبسم کی چاندنی میں جمالِ فطرت نہا رہا ہے
کلی کلی ہے بہار افشاں ، چمن بہ ہر رنگ کیف زا ہے

ہزار جور و جفا سہیں گے ، تجھے نہ ہم بے وفا کہیں گے
وفا کے پیاں کا توڑ دینا ، مذاہبِ عشق میں روا ہے

تری جفاے وفا نما سے سکوں ملے ہے دل حزیں کو
خوشی کبھی اب نہ راس آئے ، خدا سے میری یہی دعا ہے

نہ تیری صورت سے آشنا ہوں ، نہ تیرے گھر کا پتہ ہے لیکن
جدہر تری جستجو میں نکلا ، ادہر ترا نقشِ پا ملا ہے

حسیں نگاہیں ، حسیں مناظر ، قدم قدم جلوہ ہاے رنگیں
کبھی جو نظریں بہک گئی ہیں تو اس میں بندے کی کیا خطا ہے

زمیں بھی بدلی ، زماں بھی بدلا ، مزاجِ حسنِ بتاں نہ بدلا
وہی ہے انداز دل بری کا ، وہی تغافل ، وہی اَ نَا ہے

جسے سنوارا ہے مال و زر سے ، جسے نکھارا ہے علم وفن سے
کیے ہیں جس پر ہزار احساں ، اسی نے مجھ کو دغا دیا ہے

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳۔

مجھے گنہگار کہنے والو! مری خطاؤں پہ ہنسنے والو!
مرا خدا مجھ کو بخش دے گا کہ اس کا لطف و کرم بڑا ہے
نہ جانے کیا بات ہے کہ وارثؔ مٹیں نہ تاریکیاں جہاں کی
خرد نے لاکھوں دیے جلائے مگر اجالا نہیں ہوا ہے

غزل

فاخرؔ جلال پوری

اخلاص سے وفا سے کوئی مطمئن نہیں ایسی کسی ادا سے کوئی مطمئن نہیں
اعصاب پر سوار ہے دن رات کی ہوس اللہ کی عطا سے کوئی مطمئن نہیں
کیا ہوگیا کہ اب کسی مردِ فقیر کی مانگی ہوئی دعا سے کوئی مطمئن نہیں
ہر سو اک انتشار کا عالم ہے، خوف ہے حالات کی فضا سے کوئی مطمئن نہیں
سب جانتے ہیں قادرِ مطلق ہے اس کی ذات اس کی مگر رضا سے کوئی مطمئن نہیں
اک سحرِ سامری کا ہے ماحول ہر طرف موسیٰؑ کے اب عصا سے کوئی مطمئن نہیں

موجِ نسیم ، بادِ صبا ہے ہوا کرے
فاخرؔ اب اس ہوا سے کوئی مطمئن نہیں

پوسٹ جلال پور، امبیڈکر نگر، یوپی۔

مطبوعات جدیدہ

مرزا عبدالقادر بیدل، حیات اور کارنامے (جلد اول و دوم): از ڈاکٹر سید احسن الظفر، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات بالترتیب ۵۰۴، ۷۱۸، قیمت ۵۰۰ و ۶۵۰ روپے، پتہ: رام پور رضا لائبریری، حامد منزل، رام پور ۲۴۴۹۰۱، یوپی۔

شاہ جہاں کے عہد نے جہاں ہندوستان کو شاہ جہانی مسجد، لال قلعہ اور تاج محل جیسے فن تعمیر کے پر جلال و جمال تحفے دیے، جن کی موجودگی شاہد ہے کہ کشور ہندوستان کا عالم کسی انجمن نازاں اور چمن خنداں سے کم نہیں تھا، جہاں طراوت گل فشانی کرتی، شاخ گل محو رقص اور بلبل نغمہ ریز رہتی، اسی صاحبقرانی کی کامرانی میں اقلیم شعر و ادب کی حکمرانی بھی شامل ہے اور مرزا عبدالقادر بیدل اسی کی خوبصورت ترین نشانی تھے، شاہ جہانی کے بعد چھ مغل بادشاہوں کے عروج و زوال اور حکومت و سلطنت کے نشیب و فراز بیدل کی نظروں سے گزرتے اور ان کی فکر کی دنیا کو زیر و زبر کرتے رہے اور دل کی دنیا، جاناں و دیگراں کے غم سے آباد ہوتی رہی

ع خورشید خرامید و فروغ بہ نظر ماند، سے ع دل آب شد و قطرہ خونے ز جگر ماند جیسے مقامات سے گزر کر ع ایں نقش قدم داغ شد و خاک بسر ماند تک کی منزلیں طے ہوتی رہیں اور زندگی کا وہ سفر جو عظیم آباد سے شروع ہوا، اڑیسہ اور پھر دہلی تک یوں طے ہوا کہ ہر نیک و بد اور خوبی و خرابی اپنے معنی بیان کرتی رہی

ع از ہر بد و نیک و زشت و زیبا خواندیم

بیدل نے اپنے ایک روحانی استاد کے بارے میں جو کہا اس کا مصداق حقیقتاً وہ خود تھے کہ

سخن محو نیرنگ موزونیش معانی اسیر فلاطونیش

اب بیدل کو ہندوستان کی فارسی شاعری کا ستون اعظم کہنے اور سمجھنے میں دشواری نہیں لیکن 'صاحب جاہ و دستگاہ' اور 'محیط بے ساحل' کی تعبیرات سے بیدل شناسی کے آغاز کا سہرا مرزا نوشہ ہی کے سر ہے، غالب کی مشکل پسند، جدت و دقت طراز اور فلسفہ و تصوف آشنا طبیعت کو ان ہی اوصاف کی بنیاد پر بیدل کی جانب مائل ہونا بھی طبعی تھا، طرز بیدل کی پیروی ان کے لیے اگر

قیامت تھی تو دراصل یہ پیرایہ عقیدت بھی تھی، غالب کے بعد شبلی و اقبال وسلیمان نے بیدل سے اعتنا و استناد کا جو سلسلہ شروع کیا، اس کی ایک جھلک زیر نظر کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے، یہ صرف ایک کتاب ہی نہیں جس کے متعلق مفید، معلومات افزا اور دلچسپ جیسے الفاظ ادا کرنے سے اس کی قدر و قیمت کا حق ادا ہو سکے، درحقیقت بارہ سو صفحات میں بیدل کے احوال، تصانیف، کلام اور افکار کا جیسا جائزہ لیا گیا ہے وہ ٹائٹل کی اس عبارت یا دعوے کو قطعی درست ٹھہراتا ہے کہ ''ہندوستانی اسلوب کے عظیم ترین نمائندہ شاعر کی حیات اور تصانیف کا تازہ ترین تحقیقات پر مبنی جامع، مستند اور مفصل مطالعہ ہے'' پہلی جلد میں دو باب ہیں، پہلا باب مختصر ہے کہ اس میں بیدل کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کا مطالعہ ہے اور یہ کیوں ضروری ہے اس سوال کا جواب بھی ہے، دوسرے باب میں بیدل کی زندگی کی ہر جھلک کو اس طرح سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پیدائش، خاندان، تعلیم، اساتذہ، احباب اور احباب میں بھی امراء و روسا، شعراء و ادباء اور تلامذہ کو الگ الگ عنوانوں سے شامل کیا گیا ہے، حد یہ ہے کہ بیدل کے رقیبوں کی فہرست بھی ہے، بیدل کی شخصی زندگی اور وفات تک ہر معلوم و معدوم قصہ یا واقعہ کو پانے اور پیش کرنے کی کوشش، فاضل مصنف کی دیدہ ریزی کے ساتھ ان کی ژرف نگاہی کا ایسا منظر پیش کرتی ہے جو قدر کے ساتھ حیرت کے احساس کو شامل ہے، دوسری جلد کے تین اور ابواب میں بیدل کی نثر اور شاعری اور افکار و خیالات کا تجزیہ ہے، تحقیق و تنقید کے لیے جس جگر اور نظر کی ضرورت ہے اور جس کی مثال حالی و شبلی و شیرانی اور ان کے طبقہ فکر نے قائم کی، فاضل مصنف نے اسی روش کو اختیار کیا اور اس روایتی تحقیق و تنقید نے لطف و لذت کی اسی دولت سے آشنا کر دیا جس سے تحقیق جدید اور تنقید مابعد جدید نے اردو قاری کو ایک مدت سے محروم کر رکھا ہے، بیدل کے تعارف میں یہ احساس ہے کہ صرف گذشتہ تذکرہ نگاروں کے بیان کو اساس نہ بنایا جائے بلکہ بیدل کی اور تحریروں میں اشاروں کو بھی پایا جائے جو روایتوں کو نیا رنگ ہی نہیں دیتے، اعتماد و استناد کی جانب رہنمائی بھی کرتے جاتے ہیں، مصنف نے مثنویوں، غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ رقعات اور تاریخی قطعات میں بھی بیدل کی اصل زندگی کی جستجو کی اور نتیجتاً سرخرو بھی ہوئے، مولانا سید سلیمان ندوی نے بیدل کا موروثی تعلق بہار سے ثابت کیا تھا، عظیم آباد اور مہسی کے بستیوں کی نشان دہی بھی ہوتی

رہی ، فاضل مصنف نے دوسرے ذرائع سے بھی یہی ثابت کیا ، دلچسپ بحث بیدل کے روحانی مرشدوں کی ہے ، شاہ قاسم ہواللّٰہی ، شاہ ابوالفیض معانی ، مرزا قلندر کی شخصیتوں کی عکاسی اور ترجمانی صرف بیدل کو سمجھنے ہی کے لیے نہیں اس عہد کے مزاج کو پرکھنے میں بڑی کارآمد ہے ، دونوں جلدوں میں کوئی صفحہ ایسا نہیں جو دلچسپی اور معلومات سے خالی ہو ، یہ بیدل کے کلام کی تاثیر ہے یا فاضل مصنف کی خوبی تحریر ہے ، بے شبہ مرزا عبدالقادر بیدل کے تعلق سے یہ دونوں جلدیں ، جامعیت میں کامل تر ہیں ، بیدل کی نثر کی خصوصیات میں متانت ، نزاکت ، رنگینی ، روشنی اور سجع و قوافی کا شمار کیا گیا ہے ، فاضل مصنف کے قلم پر ان کا اثر ظاہر ہے تاہم روانی میں کچھ تعبیریں عامیانہ بھی آگئی ہیں جیسے گول کر جانا ، چکر میں پڑ جانا ، پلے پڑنا ، اسی طرح 'ممکن نہ ہوسکنا' کی عام غلطی کا ہونا بھی اچھا نہیں لگا ، بعض حدیثوں کی روایت اور ترجمانی میں احتیاط کی ضرورت تھی جیسے یہ کہ "بہت سے پھٹے حال لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ان کے بال بکھرے اور لباس تار تار ہوتے ہیں الخ" شاہ ملوک کی برہنگی کے لیے لباس کے تار تار ہونے کا مفہوم حدیث کے الفاظ سے قطعی ظاہر نہیں ، کتاب کے باطن کی طرح ظاہر بھی دلآویز ہے ، رضا لائبریری کے اعمال حسنہ میں احسن الظفر صاحب کی اس تالیف کی اشاعت مقدر تھی جس کے لیے وہ تبریک و تحسین کی مستحق ہے ، گزشتہ لکھنؤ سے اگر یہ شائع ہوتی تو شاید کتاب کا نام یوں بھی ہوتا کہ احسن السیر بہ زبان احسن الظفر ۔

عقلیات قرآن کریم : از ڈاکٹر فاطمہ اسماعیل مصری ، مترجم ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی ، متوسط تقطیع ، عمدہ کاغذ و طباعت ، مجلد مع گرد پوش ، صفحات ۴۲۸ ، قیمت درج نہیں ، پتہ : پبلی کیشنز ڈویژن ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، ۲۰۲۰۰۲ ۔

مصر کی ایک اہل قلم خاتون نے فلسفہ اسلامی کو اپنا مستقل موضوع اس طرح بنایا کہ ایم اے اور بعد میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسی مضمون کی حاصل کی ، زیر نظر کتاب کا عربی نام **القرآن والنظر العقلی** ہے ، اصلاً یہ ایم اے کے لیے لکھا گیا مقالہ ہے ، فاضل مترجم کو علوم القرآن سے خاص شغف ہے اور اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں اور مضامین ہیں اور ان سب میں تدبر و تفکر کی خوبیاں ان کے ذوق و مزاج کی عکاسی کرتی ہیں ، غالباً اسی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے

زیر نظر کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔ **النظر العقلی** کا ترجمہ عقلیات سے کرنے کی وجہ بھی انہوں نے ابتداء میں واضح کر دی کہ عقلیات، علم کلام کی کلاسیکی اصطلاح ہے جس کا استعمال فخر الدین رازی سے امام جرجانی تک ترقی پذیر شکل میں ہوتا رہا، متقدمین و متاخرین دونوں کے نزدیک اس سے وہ علم مراد ہے جو مشاہدہ وعقل کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے اور اسی معنی میں وہ علوم شرعیہ و دینیہ کے گویا مقابل ہے، بعد کی وضاحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ علماء کے نزدیک مقابل کی حیثیت بہر حال متصادم کی نہیں، صوفیہ کے نزدیک عقل گرچہ محو تماشائے لب بام زیادہ رہی لیکن بقول مترجم مابعد الطبیعاتی درجہ پر صوفیہ نے عقل کو اپنے زاویوں سے خارج نہیں کیا بلکہ یوں قبول کیا کہ یہ طویل بحثوں کے موضوع کی حیثیت سے ذکر وفکر کی مجلسوں کو گرماتی رہی، گذشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں مغرب کی عقلیت پرستی نے جس طرح مذہب کے در و دیوار میں رخنہ اندازی کی، اس کے دفاع کے لیے ایک نیا علم کلام وجود میں آ گیا جس کے ذریعہ دین کی تعبیر وتشریح میں عقل سے کام لیا گیا، زیر نظر کتاب بھی اس نئے علم کلام سے ربط وشغف کی ایک کڑی ہے جس میں خوش بخت مصنفہ کی نظر نے تدبر، تفکر، بصیرت، **اولو الالباب**، **اولو النهی**، **فاعتبروا** اور **افلا تبصرون** کی بار بار کی تلقین وتاکید اور قرآنی اسلوب کے غایت درجہ اہتمام کو اس حیثیت سے دریافت کیا کہ عقلی تدبر ہی وہ انسانی وسیلہ ہے جو قرآن مجید پر غور و فکر کر کے منزل مقصود تک رسائی کو آسان بناتا ہے، یہ عقدہ دشوار نہیں رہا کہ عقل کو قرآن نے جس طرح استحکام بخشا وہ انسانیت کی تاریخ میں نہ آسمانی کتابوں میں ملتا ہے نہ انسانی کتابیں ہی اس کی مثال پیش کر سکتی ہیں، عقلیات قرآنی کے مقاصد، مصنفہ کی نظروں کے سامنے رہے یعنی عقل انسانی کی صحت مند تعمیر، موجودات کے اسرار ورموز کا ادراک اور ایک مدبر وحکیم خالق کے وجود پر ایمان وغیرہ، مقاصد کی حقیقت سامنے ہو تو بحث اور فکر ونظر کے سیدھے راستے خود بخود ہموار ہوتے جاتے ہیں، چنانچہ النظر، العقل کی وضاحتوں کے بعد متعدد فصلوں میں قرآن مجید میں عقلی تدبر کی دعوت، اس کا منہاج، عقیدہ اسلامی کی تعمیر میں اس کا کردار، وحدانیت و رسالت اور موت و مابعد موت کے تصورات میں اس کی کارفرمائیاں اس طرح بیان کی گئیں کہ فلاسفہ اسلام کی تشریحات کے سایہ میں فکر اسلامی کو گویا پھر تازگی مل گئی اور عقل انسانی سے قرآنی خطاب کی

ضرورت یوں ثابت ہوئی کہ یہ دراصل فطرت سلیم کا تقاضہ ہے یعنی معاصر مسلمان، روح القرآن کو ایک بار پھر سمجھے اور صحیح انسانی تہذیب کے قیام وفروغ کے لیے نص قرآن کی تنفیذ کرے۔ظاہر ہے کہ عقل و فلسفہ کی اصطلاحوں سے گراں بار اس بحث کا اپنے عربی اسلوب ومزاج کے لحاظ سے اردو قارئین کے لیے مانوس ہونا آسان نہیں لیکن فاضل مترجم نے کامیابی سے کوشش کی کہ مباحث کی تفہیم آسان ہو، گرچہ بعض مقامات میں وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مثلاً صفحہ ۱۳۵ کی کچھ عبارتیں، ہوسکتا ہے ترجمہ کی دیانت نے تشریح وتبیین کی اجازت نہ دی ہو۔بہرحال علوم قرآنیہ کے اعلی قارئین کے لیے یہ کتاب چشم و عقل کشا ہے اور اس مبارک خدمت قرآنی کے لیے فاضل مترجم کی نظر اور قلم دونوں شکریہ کے مستحق ہیں۔

مجالس حسنہ: مرتبہ مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۶۸۷، قیمت ۳۳۰ روپے، پتہ: مکتبۃ الشباب العلمیہ، ندوہ روڈ ٹیگور مارگ، لکھنؤ نمبر ۲۰۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے متعلق اہل نظر کی زبان پر اکثر یہ مصرعہ آجاتا کہ

وہ ہند میں سرمایہ ملت کے نگہباں

ہندی ملت اسلامیہ کے سرمایہ کے نگہبان ہی نہیں، تعلیمات، افکار، نظریات اور اعمال واخلاق میں ان کی ذات وشخصیت، اسلام کے تصور مرد مومن کی نمایندہ تھی، اسلام کے لیے ان کی ہمہ جہت خدمات نے واقعتاً ان کو عالم گیری عطا کی اور اس کا اعتراف غیروں تک نے کیا، جلوتوں میں ان کو ایک عالم نے دیکھا اور ان کی مرجعیت ومقبولیت کے مشاہدہ کے ساتھ شہادت دی کہ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں، لیکن وہ جن کی نظریں ظاہر کے علاوہ باطن کی دنیا تک پہنچتی ہیں ان کی زبان سے موفق من اللہ اور آیۃ من آیات اللہ جیسے الفاظ ادا ہوئے اور جن کے نطق نے خدا جانے کس جذبے سے اعلان کیا کہ مولانا سے محبت، ایمان کی علامت ہے، یہ بات بڑوں کی ہے لیکن مولانا کے مقام بلند کو سمجھنے کے لیے جلوتوں کے علاوہ ان کی خلوتیں بھی اپنی فضاؤں میں نہ جانے کتنے رنگ اور کتنی خوشبوئیں رکھتی ہیں، مولانا کی وہ مجلسیں جن کے شرکاء محدود اور مانوس ہوتے تھے، ان میں بھی روش عام کے برخلاف صرف حکمت وموعظت کے ستارے جگمگاتے تھے، سادگی اور بے تکلفی کی دنیا میں بھی مولانا باتوں باتوں میں علم ودانش کے موتی بکھیرتے، مجلسی گفتگو کے نفع کو افادہ میں بدلنے کی مولانا ندویؒ نے راہ دکھائی تھی، یک دو ساعتے با اہل دل کو کون

فراموش کر سکتا ہے، اب زیر نظر اسم با مسمی کتاب میں علامہ حسنی کی مجالس حسنہ کو پیش کر کے لائق مرتب نے حسن تقلید کی پاکیزہ روایت کی توسیع کی ہے، قریب ایک سو ساٹھ مجلسوں کی باتوں کو ان کی سماعت نے محفوظ کیا اور اب ان کے قلم نے دوسروں کے لیے یہ سوغات تیار کر دی، حق یہ ہے کہ اس مجموعہ میں مولانا کی زندگی کا عطر ہے، جس میں کلمہ اسلام کی سربلندی کی خوشبو خدا جانے کتنی سمتوں سے پھیلتی ہے، خاندان، اساتذہ، علماء، صوفیہ، قرآن، حدیث، تاریخ، ادب، شعر، سیاست اور سب سے بڑھ کر ایک انسان کے وہ لمحات بھی جو کبھی رنج و غم اور کبھی مسرت و زندہ دلی سے عبارت ہوتے ہیں، قدرتاً ان مجلسوں میں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور دارالمصنفین کی باتیں ہیں، بار بار تکرار ہے کہ ہندوستان میں تصنیف و تالیف کے جدید اصول کا آغاز علامہ شبلی کا عطیہ ہے، یہ بھی کہ "علامہ شبلی کو علی گڑھ میں ذہین طالب علم ملے، ان کے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے جو اسلوب اختیار کیا اس میں علمیت کے ساتھ ادبیت کی چاشنی ضروری سمجھا ورنہ جدید طبقہ متاثر نہ ہوتا، مولانا حالی نے بھی یہ اسلوب اختیار کیا لیکن شبلی آگے نکل گئے، ان کی ہر کتاب میں ادبیت ہے، الفاروق ہو، الغزالی یا المامون، پھر سیرت النبیؐ تو ہے ہی، ایک گفتگو میں پھر فرمایا کہ سیرۃ النبیؐ سب سے مفصل و مدلل کتاب ہے جس نے وقت کی ضرورت کو پورا کیا، ایک بار فرمایا کہ خطبات مدراس منفرد کتاب ہے، سیرت پر ہم نے اس سے موثر کتاب نہیں دیکھی جو تقابلی انداز میں لکھی گئی ہو، اصلاً یہ مجلسیں صدیوں کے علم و معرفت کی ترجمان ہیں، لائق مرتب نوجوان ہیں، مادری زبان بھی اردو نہیں لیکن انہوں نے جس سلیقے سے حواشی مرتب کیے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں، بے شمار شخصیات و واقعات کے متعلق اتنے جدید جامع حاشیے، کم کسی کتاب میں دیکھنے میں آتے ہیں، انسائیکلو پیڈیائی حواشی نے اس کتاب کو عام ملفوظات وارشادات اور اقوال کی کتابوں سے کہیں ممتاز کر دیا ہے، مفصل اشاریے اور کتابیات اس پر مستزاد۔ اصل خوبی اور نفع کا اندازہ صرف کتاب کو دیکھ کر ہی لگایا جاسکتا ہے، سیرت کی اصلاح ہی نہیں صحیح ذہن سازی کے لیے بھی اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لیے مفید ہے جو جویائے حق اور طالب ہدایت ہے۔

خطبات تعلیم و تربیت: از پروفیسر محسن عثمانی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۰۸، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: پدی بک ڈسٹری بیوٹرس، ۴۵۵، پرانی حویلی، حیدرآباد نمبر ۲۔

تعلیم و تربیت کے عملی امکانات، مسائل و مشکلات اور فوائد و فتوحات کے بارے میں اس رائے

سے بڑھ کر کس کی بات ہوسکتی ہے جس نے برسوں تعلیم و تعلم کے بحر کی شناوری کی ہو، زیر نظر کتاب میں مثالی استاذ، بہترین معلم، دینی مدارس، عصری تعلیم، ہمہ جہتی تعلیم، دنیائے دانش، قصہ قدیم و جدید، دینی تربیت، اسلامی ہوسٹل اور خود احتسابی جیسے موضوعات پر فکر مندانہ اور دردمندانہ اظہار خیال ہے، چند مضامین بظاہر دوسرے عنوانوں سے ہیں جیسے ہندوستان میں علم حدیث، تصوف، دارالمصنّفین اور دائرۃ المعارف وغیرہ لیکن ان سب کا تعلق بھی دیکھا جائے تو اصل بحث یعنی تعلیم و تربیت ہی سے ہے، چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر، کے زیر عنوان پہلا مضمون ہے اور یہی پوری کتاب کا چہرہ بھی ہے اور آئینہ بھی، فاضل مصنف مدرسہ کے نمایندہ ہیں اور عصری جامعات کے فضا آشنا بھی، اس لیے ان کا یہ احساس لائق توجہ ہے کہ ''جن علوم کو چشمہ حیواں کہا گیا ہے، بلاشبہ وہ مسلمانوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اور متاع گراں مایہ ہیں، اسی کے ساتھ کشت زار کا استعارہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے، فکر مدرسی کی تشکیل کے لیے دونوں کا پورا پورا لحاظ بہت ضروری ہے......(یعنی) عصری رجحانات اور جدید سائنس کے نظریات پر مدرسوں میں توسیعی خطبات کا انتظام ہو'' مصنف کم نظر نہیں اس لیے قصہ قدیم و جدید ان کے نزدیک بے معنی ہے، ان کا یقین ہے کہ تعلیم کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو نئی نسل تک پہنچانے اور اس کی زندگی کا جزو بنانے کا نام ہے۔ کتاب کا ہر مضمون اسی اجمال کی شرح و تفصیل ہے، تعلیم خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کی فکر رکھنے والوں کے لیے اور ان کی گزرگاہ خیال کو روشن و منور کرنے کے لیے یہ کتاب بڑی کارآمد ہے، فاضل مصنف اپنے شگفتہ، دلکش اور دلآویز اسلوب نگارش کے لیے معروف ہیں، یہ کتاب حسن انشاء کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔

تاریخ اعظم گڑھ: از شاہ افضال اللہ قادری مرحوم، ترتیب و تقدیم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: سالم بک ڈپو، یک منارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ۔

خطہ اعظم گڑھ کا شمار کبھی شیراز مشرق جونپور کی عملداری میں تھا، جونپور آج شہر آثار و باقیات ہے لیکن اعظم گڑھ نے شیرازی شان کو آج بھی برقرار رکھا ہے، بہت زیادہ قدیم نہ ہونے کے باوجود اس کو تاریخی حیثیت حاصل ہے، زیر نظر کتاب میں اسی داستان کو مختلف عنوانوں سے سنایا گیا ہے، قادری مرحوم نے برسوں پہلے یہ کتاب لکھی تھی، فاضل مرتب نے اس کو مرتب و مہذب کر کے اس کی اشاعت کا قابل قدر کام کیا۔

ع - ص

رسید مطبوعہ کتب

۱-آزادی ہند میں مسلمانوں کا کردار: من جانب دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال (ایم۔پی) انڈیا۔ مطبع اور قیمت درج نہیں

۲-اجالے اور ہالے: معین کمالی، فرید پبلی شرار دو بازار، کراچی۔ قیمت ۲۰۰ روپے

۳-ایصال ثواب کے لیے اجتماعی ختم قرآن ویٰسین شریف کی شرعی حیثیت: مولانا یعقوب قاسمی، مجلس تحقیقات شرعیہ برطانیہ، ۳۴ وارن اسٹریٹ سیول ٹاؤن، ڈبلیو ایف ۱۲، 9LX دیوس بوری (یوکے)، جامعہ علوم القرآن جمبوسر، بھروچ گجرات۔ قیمت درج نہیں

۴-پہلا قدم: سید اختر حسن، ۷ کربلا بھوپال، کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت ۳۵ روپے

۵-تحفۂ برما: از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مرتب سید محمود حسن حسنی، مکتبہ اسلام، روؤف مارکیٹ، گوئن روڈ، لکھنؤ، مکتبہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں

۶-جدید عربی ادب اور ادبی تحریکات: ڈاکٹر ابوعبیدہ، الکتاب انٹرنیشنل، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی اور ندوی پبلی کیشنز، سری نگر، کشمیر۔ قیمت درج نہیں

۷-شخصیات: مولانا پروفیسر حسان خان، مکتبہ دین ودانش، غریب خانہ، ۱۳ر مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔ قیمت ۱۲۵ روپے

۸-شعور وادراک: محمد ایوب واقف، دانش محل لکھنؤ، شب خون، کتاب گھر، الہ آباد، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی۔ قیمت ۲۵۰ روپے

۹-شمالی آرکاٹ میں اردو: ڈاکٹر جاویدہ حبیب، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، مکتبہ ماہنامہ لاریب، محمد علی لائن، لکھنؤ۔ قیمت ۳۵۰ روپے

۱۰-عطر گل مہتاب: اسلم مرزا، سب رس کتاب گھر، ایوان اردو پنچہ گٹہ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔